سرسید شناسی

مبالغے اور مغالطے

تحقیق و ترتیب

مجاہد حسین

نشریات

الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔ فون: 0321-4589419

انتساب

دادا ابو

اور

ثاقب کے نام

جگہ جگہ تری موجودگی کو پاتے ہیں
ہمارے درد فراواں ہمارے اشک رواں
(مجید امجدؔ)

ترتیب

حرفِ چند

سرسید احمد خاں جامع الحیثیات شخصیت تھے۔ وہ دانشور، ماہرِ تعلیم، مفسر، مفکر، سیاستدان، محقق، مدون، فلسفی، ادیب، مؤرخ غرض بہت کچھ تھے۔ ان کی فکر ونظر اور سوچ کے دوائر بہت وسیع تھے۔ ان کی وسعت کو دیکھتے ہوئے ماضی قدیم کے فلسفی ارسطو کا خیال ذہن میں آتا ہے۔ ارسطو نے علم ونظر کے بہت سے متنوع موضوعات اور مضامین پر کام کیا۔ بہت سے سوالات اٹھائے اوران کا جواب دینے کی کوشش کی۔ ان کے بے شمار نظریات اور خیالات آج غلط ثابت ہو چکے ہیں، مگر ان کی عظمت اسی طرح قائم ہے کہ انھوں نے بے شمار سوالات اٹھائے اور ان کا جواب دینے کی کوشش کی۔ سرسید احمد خاں کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ انھوں نے متنوع مضامین وموضوعات پر کام کیا۔ بے شمار سوالات اٹھائے اور ان کا جواب دینے کی کوشش کی۔ زمانے کی گردشوں نے ان کی بہت سی باتوں کی تصدیق مزید کردی اور بہت سی باتوں کی تردید بھی کردی۔ اس تردید سے اُن کی عظمت کم ہونے کی بجائے اور زیادہ ہوگئی۔ وہ اس لیے کہ اتنے بہت سے نئے سوالات اٹھانا اوران کے جوابات تلاش کرنا بجائے خود ایک عظیم کارنامہ ہے۔ بہرحال سرسید کی عظمت اس سے بھی آگے کی ہے۔

سرسید احمد خان نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی، احادیث پر قلم اٹھایا، فقہ وکلام کو موضوعِ بحث بنایا، تاریخ کی امہات کتب کی تدوین کی، ریاضی اور طبیعیات کے موضوع پر قلم اٹھایا۔ اردو گرامر کی تدوین کی کوشش کی اور رموزِ اوقات کا تعین کیا۔ تاریخ کے بعض نازک ادوار پر بنیادی نوعیت کا مواد فراہم کیا، ہومیوپیتھی پر دو کتابچے لکھے، تصوف اور کلام پر قلم اٹھایا، امام غزالی، شاہ ولی اللہ دہلوی اور شاہ عبدالعزیز دہلوی کی تحریروں کے تراجم کیے۔ دہلی کے مٹتے ہوئے آثار اور آثار آسا انسانوں پر قلم اٹھایا۔ مستشرقین کے اصولِ تحقیق کی بنیاد پر سیرت النبی ﷺ پر جامع

کتاب خطبات احمدیہ رقم فرمائی اوران کے اعتراضات کی تردیداورتغلیط کی۔تورات کے عبرانی متن کوسامنے رکھ کراردو میں اس کی تشریح کی اور تقابلِ ادیان کے لیے ایک مضبوط علمی بنیادفراہم کی۔انھوں نے اپنے وقت کے سیاسی مسائل پر اپنی رائے کے مطابق کام کیا اور بھرپور کام کیا۔یہ سب اُن کی شخصیت کا مکمل تعارف نہیں ہے۔

سرسیداحمد خان کی شخصیت اوراس قدر وسعتوں کی حامل شخصیت ، بھلاانھیں قلم کی گرفت میں لانا کہاں آسان تھامگران پرمشرق ومغرب کے دانشوروں اورمحققین نے کام کی کوشش کی اور بعض کوششیں خاصی کامیاب بھی کہی جاسکتی ہیں،مگرعمومی طور پر ہمارے سرکاری دانشوروں نے سرسید کی بجائے سرسید کی ایک خودساختہ شخصیت متعارف کروانے کی کوشش کی ۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں ٹیسٹ پیپر، خلاصے اور گیٹ تھروگائیڈز خاصے مقبول تھے، یہ خودساختہ شخصیت بھی ٹیسٹ پیپر،خلاصےاور گیٹ تھروگائیڈز کی طرح خاصی مقبول ہوگئی۔اس سے ایک بات تو یہ ثابت ہوتی ہے کہ کسی بات کے مقبول ہونے کے لیے معقول ہونا ضروری نہیں ہے۔ بہرحال ہمارے نصابات میں ماہرِ تعلیم سرسید، سیاستدان سرسیداور سیاسی مفکر سرسید کی ایک خودساختہ تعبیر متعارف کرائی گئی،ان کی دیگر حیثیات سے ہمارے نصابات بےخبر رہےاور شاید مدتوں بےخبر رہیں۔

سرسیداحمد خان کی بطور ماہرتعلیم ، بطور سیاستدان اور بطور سیاسی مفکر کی ایک خودساختہ تصویر متعارف کرانے کے بعض مقاصد تھے۔ پاکستان جب وجود میں آیا تو بعض لوگوں نے چاہا کہ اسے ایک جغرافیے اور ثقافت کے طور پر سامنے لانے سے کسی نہ کسی طرح گریز کیا جائے۔اس کی بجائے اسے ایک نظریے کے طور پر پیش کیا جائے۔جغرافیے کے طور پر ماننے میں سوخطرے تھے۔اس صورت میں پاکستان عالمی امپیریلزم کے ایجنڈے پر کیوں کام کرتا اور کیسے کرتا ؟ پاکستانی ثقافت سچی حب الوطنی کی بنیاد بن سکتی تھی اور عالمی قوتوں کی گماشتگی میں رکاوٹ بن سکتی تھی،اس کے متبادل کے طور پر نظریے کی تشکیل کی گئی اور جغرافیے کی بجائے نظریے سے وفاداری حُب الوطنی کا اصلِ اُصول قرار پایا۔ضرورت تھی کہ نظریے کو ماضی کی فکری تاریخ اور نظریہ سازوں کی تائیدبھی مہیا کی جائے۔اس مقصد کے لیے سرسیداحمد خان کو تختۂ مشق بنایا گیا۔مولوی عبدالحق نے ان کے خیالات کو آگے پیچھے کر کے ان کی تحریروں سے دوقومی نظریہ اخذ کر کے دکھایا۔ اُن سے نظریے کا جعلی انتساب بھی زمانے کے عجائبات میں سے ہے۔ان کے تعلیمی نظریات میں

سے بعض اجزا بھی ہماری ہیئتِ حاکمہ کے لیے مفید ٹھہرے تھے، انھیں قبول کرنے میں حرج ہی کیا تھا؟ ان نظریات کی تردید بھی سرسید احمد خان کے ہاں موجود تھی، ان تردیدی حوالوں پر آنکھیں بند بھی رکھی جاسکتی تھیں چنانچہ آنکھیں بند کر لی گئیں۔ سرسید احمد خان کے بعض فیصلے ہمارے آج کے دور میں سامنے لانا ممکن نہیں تھے ـــــ تو کیا ہوئے؟ اپنی طرف سے کچھ باتیں لکھ کر سرسید کے نام سے منسوب کی جاسکتی تھیں، آخر ہم آپ کتابیں لکھ کر اپنے بزرگوں کو Dedicate کر سکتے ہیں تو اپنے خیالات کا ان کے نام انتساب کیوں نہیں کر سکتے۔

سرسید احمد خاں سے یہ کھلواڑ ایک عرصے سے ہو رہا تھا۔ جناب ضیاء الدین لاہوری اسی نصابِ تعلیم کے تربیت یافتہ تھے مگر انھوں نے قدرت سے تحقیقی مزاج پایا تھا۔ انھوں نے استادوں کی پڑھائی ہوئی باتوں کو حرزِ جاں بنانے اور بنائے رکھنے کی بجائے تحقیق کا راستہ اپنایا۔ تحقیق کے سفر میں انھیں نصابوں میں مروج سرسید سے ایک مختلف سرسید نظر آئے۔ انھوں نے حقیقی سرسید سے شناسائی حاصل کی۔ پھر یہی آشنائی اور شناسائی ان کے تحقیقی کام کا سرِ آغاز ٹھہری۔ انھوں نے سرسید احمد خاں پر سات کتابیں لکھیں اور پوری محنت و دیانت سے لکھیں۔ کوشش کی کہ سرسید کو انھی کے لفظوں میں پیش کیا جائے اور نصابی مصنفین کے تراشیدہ سرسید کی حقیقت بیان کر دی جائے۔ ضیاء الدین لاہوری کی یہ تحقیق اس لیے اپنا جواز رکھتی ہے کہ سچائی کو کسی سرکار کی تائید کی ضرورت نہیں۔ یہاں ایک اور بات کہنا بھی بہت ضروری ہے کہ فرد چاہے جتنا بھی بڑا ہو، دلیل کا متبادل نہیں ہوسکتا۔ ایسے ہی حقیقت کو اپنا آپ منوانے کے لیے کسی بڑے یا چھوٹے شخص کی تائید یا تصدیق کی ضرورت نہیں ہوتی۔ نظریاتی لوگوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ ماضی کی من پسند تشکیل کرتے ہیں یہاں تک بات قابلِ برداشت ہو جائے، مگر انھیں یہ حق حاصل نہیں کہ ماضی کے حقائق کو ایک طرف رکھ کر ایک فرضی بیانیہ تسلیم کرلیا جائے۔ ایسا کرنے کا حق کسی نظریاتی یا غیر نظریاتی شخص کو نہیں دیا جاسکتا۔ ہمارے نصابی مصنفین نے سرسید سے متعلق جو بیانیہ تشکیل دے رکھا ہے وہ خود فریبی سے زیادہ نہیں۔ ضیاء الدین لاہوری نے علم وادب کے قارئین کو خود فریبی سے باہر لانے کی کوشش کی ہے یہ کوشش یقیناً ثمر بار ہوگی۔

عزیزم مجاہد حسین نے ضیاء الدین لاہوری کی تحقیق پر قلم اٹھایا اور تحقیق کے میدان میں ان کے حاصلات اور ان کے تحقیقی نتائج کی قدر و قیمت متعین کی ہے۔ ان کا کام یقیناً اپنا جواز رکھتا

ہے اس سے تحقیق کا کام آگے بڑھے گا، ممکن ہے اس کام کے بعد سرسید کی جامع الصفات شخصیت کی دریافت کا کام آگے بڑھ سکے اگر ایسا ہوا تو یہ کام یقیناً ایک کارنامہ ہو گا۔

والسلام
پروفیسر امجد علی شاکر
لاہور

۲۵۔جنوری ۲۰۱۷ء

مقدمہ

زیرِنظر کتاب میرے ایم۔فل کے تحقیقی مقالے بعنوان ''ضیاءالدین لاہوری بہ حیثیت سرسید شناس'' کی ترمیم شدہ صورت ہے جو استادِ محترم ڈاکٹر زاہد منیر عامر صاحب کی زیرِ نگرانی لکھا گیا۔اس مقالے کا پہلا باب سوانح و شخصیت کے متعلق تھا جو حذف کر دیا گیا ہے اور باقی ابواب میں کچھ اضافے اور تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ پہلے باب میں سرسید شناسی کی روایت کو پیش کیا گیا ہے اور مختلف سرسید شناسوں کی آرا پیش کی گئی ہیں۔دوسرے باب میں سرسید کے مذہبی، سیاسی اور تعلیمی افکار کے حوالے سے پائے جانے والے مبالغے اور مغالطوں کا بیان ہے۔''ضیاءالدین لاہوری کا معروضی طرزِ تحقیق'' کے عنوان سے بنائے گئے باب میں ضیاءالدین لاہوری کی سرسید شناسی کو موضوع بنایا گیا ہے۔محاکمہ میں ضیاءالدین لاہوری کے کام کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔آخر میں کتابیات بنائی گئی ہے اور اشاریہ ترتیب دیا گیا ہے۔

سرسید احمد خاں کی شخصیت سیاسی، تعلیمی، ادبی اور مذہبی جہات کی حامل ہے۔ان کی عملی زندگی کا دائرہ بے حد وسیع ہے، وہ بیک وقت مصلح، مؤرخ، تدوین کار، مفسر اور آرکیالوجسٹ تھے، وہ جدید علم الکلام پیش کر رہے تھے۔انھوں نے لغات کی طرف اردو دنیا کو متوجہ کیا، جدید زراعت کی تعلیم کا آغاز کیا، ہومیوپیتھی کو متعارف کرایا، سائنسی کتب کے تراجم کیے پھر تفسیر القرآن میں وہ ایک باقاعدہ مکتبۂ فکر کے بانی تھے۔

ضیاءالدین لاہوری ۱۲ جولائی ۱۹۳۵ء کو معراج الدین کے ہاں لاہور کے علاقہ گڑھی شاہو میں پیدا ہوئے۔ان کا موضوع سرسید کی عملی زندگی میں قومی تعلیمی تحریک ہی نہیں بلکہ ان کی سیاسی زندگی، ان کے عقائد و نظریات اور بعض ایسے افکار ہیں جو ہماری قومی زندگی کا اہم مسئلہ ہیں۔ان حوالوں سے سرسید احمد خاں کی ایک ایسی شخصیت منصۂ شہود پر لائی جاتی ہے جو حقیقی نہیں

بلکہ قومی ضرورتوں کے تحت تشکیل دی گئی ہے۔ ممکن ہے یہ باتیں سیاسی طور پر مفید ہوں۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قومی زندگی میں اس سے کوئی فائدہ حاصل کیا جا سکے مگر حقیقت یہ ہے کہ بعض لوگوں کے تراشیدہ سرسید کی یہ تصویر تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتی۔ انھیں ہمارے ہاں تاریخِ پاکستان لکھنے والے محققین نے تراشا ہے یا مولوی عبدالحق جیسے اردو دانوں نے۔ یہ کیا المیہ ہے کہ ایک شخص کو خاموش کرا کے اس کے ذمّہ وہ خیالات و نظریات منسوب کر دیے جائیں جو اس نے کبھی سوچے بھی نہ ہوں۔ ضیاء الدین لاہوری نے کوشش کی ہے کہ یہ مخصوص قسم کا سرسید پیش کرنے کی بجائے وہ سرسید پیش کیا جائے جو تاریخ میں پیدا ہوا، جس نے کتابیں لکھیں، علی گڑھ میں کالج قائم کیا، وہ تقریریں کرتا رہا، وائسرائے کی کونسل کا ممبر رہا اور ان سب سے پہلے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انگریزوں کے ساتھ کھڑے ہو کر جنگِ آزادی کو غدر اور بغاوت کہتا رہا۔ اس نے اس غدر کو دبانے کے لیے تن، من، دھن کی ساری قوتیں صرف کر دیں۔ اس نے انگریزوں سے آزادی کا کبھی سوچا بھی نہ تھا وہ چاہتا تھا کہ انگریزوں کی حکومت ابدالآباد تک قائم رہے اور مسلمان اس کی حقیقی رعایا بن کر رہیں۔

یہ حقیقی سرسیّد تہذیب الاخلاق کے صفحات پر نظر آتا ہے، تحریروں اور تقریروں میں نظر آتا ہے، اپنے خطوط میں اور خودنوشت تحریروں میں نظر آتا ہے اور حالی جیسے سوانح نگار کے ہاں نظر آتا ہے۔ ضیاءالدین لاہوری نے یہی سرسید دریافت کیا ہے۔ اُن سے کسی نے سوال کیا: "کل قیامت کو کس منہ سے سرسید سے ملو گے؟"

لاہوری صاحب کہنے لگے: "قیامت کے روز سرسید بہت سے مصنفین کو ڈانٹ کر اپنے سے دور کر دیں گے اور مجھے دور سے بلا کر گلے لگائیں گے اور یقیناً کہیں گے کہ یہ شخص میرا بیٹا ہے، اس نے میرے بارے میں سچ بولا ہے۔"

اچھا ہوا ضیاء الدین لاہوری نے سچ بول کر سرسید کے بارے میں لوگوں کو آگاہ کر دیا۔ بعض لوگوں نے سیاسی ضرورت کے تحت جو نیا سرسید تراش رکھا ہے، ضیاءالدین لاہوری کی تحقیق کے بعد اس کی اصل تصویر اب سامنے آجائے گی۔ سرسید کے علمی کارناموں پر نئے زاویے سے تحقیق کا آغاز ہوگا۔ ضیاءالدین لاہوری کی تحقیق سے علمی سرسید کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا۔

الغرض سرسید احمد خاں سچے آدمی تھے، وہ کبھی جھوٹ کے روادار نہ تھے، زیادہ سے زیادہ

ان کے ہاں دروغِ مصلحت آمیز دیکھا جا سکتا ہے۔ اپنی ذات کے بارے میں وہ کسی قسم کے مبالغے، جھوٹ یا بناوٹ کے حق میں نہ تھے۔ خوش نصیبی ہے کہ سرسید کو ضیاء الدین لاہوری جیسا سچا محقق ملا۔ ضیاء الدین لاہوری کی تحقیق سرسید کو کم تر (damage) نہیں کرتی بلکہ دریافت کرتی ہے اور اس سے سرسید کی عزت و وقار میں ذرا بھی فرق نہیں آتا۔ وہ ہماری تاریخ کے شجرِ سایہ دار ہیں جن کے سائے میں آنے والی صدیاں علمی و ادبی راحت حاصل کر رہی ہیں۔

ضیاء الدین لاہوری نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ سرسید احمد خان کی شخصیت، ان کی تحریروں اور اقوال پر تحقیق میں گزارا جس کا ثمر ان کی مذکورہ موضوع پر نصف درجن سے زائد کتب ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ تقویم، رویت ہلال اور آخری مغلیہ دور کا ہندوستان ان کی تحقیق کے میدان ہیں۔ یہ سوال ابھرتا ہے کہ آخر انھوں نے اپنی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں صرف ایک موضوع پر تحقیق میں کیوں صرف کیں۔

اس حوالے سے محمود الحسن لکھتے ہیں:

''سرسید احمد خان کی ذات سے دلچسپی اور اسے موضوعِ تحقیق بنانے کا خیال انھیں ایم۔اے کے دوران پیدا ہوا۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ ان کے ایک استاد نے لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی کو ہدفِ تنقید بنایا۔ چند ہی روز قبل انھوں نے سرسید کی سوانح عمری حیات جاوید کو پڑھا تھا جس کے مصنف سرسید کے قریبی ساتھی اور ممتاز ادیب مولانا الطاف حسین حالی تھے۔ اس کتاب میں سرسید کے حوالے سے ایک تحریر تھی، جس میں انھوں نے لارڈ میکالے کی بہت زیادہ تعریف و توصیف کی تھی۔ ضیاء الدین لاہوری نے لارڈ میکالے کے بارے میں سرسید احمد خان کے خیالات کو استاد کے گوش گزار کیا اور ان سے استفسار کیا کہ آپ لارڈ میکالے کی مذمت کر رہے ہیں اور ادھر سرسید احمد خان اس کی شان میں رطب اللسان ہیں آخر کس کی بات کو صحیح مانا جائے؟ اس پر استاد نے سرسید کی مدافعت میں جو عُذر تراشے وہ انھیں قائل نہ کر سکے۔ لارڈ میکالے کے بارے میں حیاتِ جاوید، کا جو اقتباس انھوں نے اپنے استاد

کے گوش گزار کیا تھا وہ انھوں نے ہمارے سامنے بھی بیان کر کے دم لیا۔"[۱۷]

محمودالحسن کی اس تحریر کے بعد یہ پتا چلتا ہے کہ ضیاءالدین لاہوری، سرسید احمد خان کی ذات اور ان کے افکار کے حوالے سے پائے جانے والے ابہام کو دور کرنا چاہتے تھے اور سرسید احمد خان کی ذات کو اس کے اصل رنگ میں دیکھنے کے خواہاں تھے۔ اسی لیے عمر بھر انھوں نے سرسید احمد خان کی ذات اور ان کی تحریروں کو اپنی تحقیق کا محور ومرکز بنائے رکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے بعض دوسرے موضوعات پر بھی تحقیق کی مگر ان کا اصل موضوع تو سرسید شناسی ہے۔ ان کی اب تک نصف درجن سے زائد تحقیقی کتب اشاعت کے مراحل سے گزر کر قارئین تک پہنچ چکی ہیں۔ آئندہ صفحات میں ان کی کتب کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

سرسید کی کہانی، ان کی اپنی زبانی

ضیاءالدین لاہوری کا یہ پہلا تحقیقی شاہ کار ہے۔ اس کتاب کو ادارہ تصنیف وتحقیق، کراچی نے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا۔ اس کتاب کے ۱۰۹ صفحات ہیں۔ اس کتاب کے تین مزید ایڈیشن ۲۰۰۴ء، ۲۰۰۵ء اور ۲۰۱۰ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

یہ کتاب اہم تحقیقی کتاب ہے۔ اس کتاب میں سرسید کی شخصیت، ان کے افکار ونظریات، ان کی تعلیمی مساعی اور انگریزی حکومت کے متعلق ان کے نظریات کو قارئین تک پہنچایا گیا ہے۔ اس کتاب کی تمام تحریریں فاضل مصنف نے سرسید احمد خان کے مضامین ومقالات سے حاصل کی ہیں۔ ضیاءالدین لاہوری نے بڑی محنت اور ایمانداری سے تمام مواد کو ترتیب دیا اور سرسید کی جو تصویر بنتی ہے وہ ایک عام نوجوان کی تصویر ہے جس کے اندر خیر وشر کی قوتیں موجود ہیں۔ ان اقتباسات سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ کس طرح سرسید نے مسلمانوں کو انگریزی غلامی کے لیے ذہنی طور پر تیار کیا اور مسلمانوں کے ایمان اور عقیدے کی بنیادوں کو کمزور کیا۔ **تہذیب الاخلاق** اور قرآنِ مجید کی تفسیر لکھ کر مسلمانوں کو مسلم تہذیب وتمدن قرآن اور اخلاقیات سے دُور کیا۔ مصنف نے اس کتاب میں حیاتِ جاوید سے مختلف یادداشتوں اور سرسید کے مختلف خطبات اور بیانات سے اقتباسات لے کر سرسید احمد خان کی کہانی بیان کی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے سرسید کی شخصیت کے جو پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں وہ بڑے فکر انگیز اور لائقِ مطالعہ ہیں۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اس

کے مقدمے میں ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری لکھتے ہیں:

''یہ تالیف جناب ضیاء الدین لاہوری کے ذوقِ علم وتحقیق کا چھوٹا سا نمونہ ہے......... یہ اُن کے معیارِ علم ونظر کی خوبی، موضوعات کی نُدرت اور تالیف وتحریر کی دل نشینی ہے جس نے اہلِ علم کو اپنی جانب متوجہ کرلیا ہے۔ ...... اگرچہ زیرِ نظر تالیف ایک محدود دائرے میں چھوٹی سی کوشش ہے لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ اور گزشتہ دورِ سیاست کے مطالعہ کا ذوق رکھنے والے طلبہ اور عام قارئین میں مقبول ہوگی اور ایک حقیقت پسندانہ اندازِ فکر اور درست نقطۂ نظر کے قیام میں اِس کے مطالعے سے مدد ملے گی۔''[۲]

جوہرِ تقویم

جوہر تقویم بھی ضیاء الدین لاہوری کی ایک بہت اہم تحقیقی کاوش ہے۔ یہ کتاب ان کی سال ہا سال کی محنت کا ثمر ہے۔ انھوں نے بڑی محنت اور ریاضت سے عیسوی تاریخوں کے مقابل ہجری تاریخیں دریافت کرنے کا طریقہ پیش کیا۔ انھوں نے عہدِ نبوی ﷺ کی تقویم کو خصوصی توجہ سے مرتب کیا۔ کتاب کا یہ حصہ تاریخ اور سیرت پر کام کرنے والے محققین کے لیے بہت اہم ہے۔ اس کتاب میں ہجری اور گریگورین کیلنڈر کے تقابلی گوشوارے بڑی محنت اور مہارت کے ساتھ دیے گیے ہیں۔

جوہر تقویم سے قبل بھی کئی کتب اس موضوع پر موجود تھیں، لیکن ان کتب سے صرف ہجری تاریخوں سے عیسوی تاریخوں کو معلوم کیا جا سکتا تھا، لیکن ضیاء الدین لاہوری کی جوہرِ تقویم سے عیسوی تاریخوں سے ہجری تاریخیں بھی معلوم کی جاسکتی ہیں۔ یوں یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک مفید اور منفرد کتاب ہے جو تاریخ کے طالب علموں، تاریخ نویسوں اور دوسرے لوگوں کے لیے معلومات کا اہم اور مستند ذریعہ ہے۔

اس کتاب کے حوالے سے ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''چند تقویمیں پہلے سے موجود ہیں لیکن جو ہر تقویم کو مرتب کر کے محترم ضیاءالدین لاہوری نے تمام محققین اور عام طلبہ کے لیے بڑی ہی اہم خدمت انجام دی ہے....... ضیاءالدین لاہوری کی جوہرِ تقویم کی ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ جہاں مشہور مستشرق وسٹنفلٹ نے ہجری سنین کے لیے عیسوی سنین اور دن اور تاریخیں متعین کی ہیں، وہاں ضیاءالدین لاہوری صاحب نے بڑی محنت سے عیسوی سنین کے متبادل ہجری سنین اور دن اور تاریخیں دریافت کر کے وسٹنفلٹ کے کام کی تکمیل کر دی ہے اور یہ بڑا کارنامہ ہے اور جس حد تک میں دیکھ سکا ہوں اُنھوں نے صحت کا خاص اہتمام کیا ہے۔ مزید یہ کہ تقویم نبوی ﷺ بھی نئے اصولوں کے تحت مرتب کی ہے جس سے عام اہلِ علم کے علاوہ سیرتِ نبوی ﷺ کے مطالعہ میں بھی بڑی مدد ملے گی۔'' [۳]

رُویت ہلال موجودہ دور میں

رویتِ ہلال ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر بحث لمبے عرصے سے جاری ہے۔ ضیاءالدین لاہوری نے اس کتاب میں بڑی محنت، عرق ریزی اور تحقیق سے رویت ہلال کے حوالے سے الجھے ہوئے معاملات کو سلجھانے اور پیچیدہ سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی ہے۔ فاضل محقق علم فلکیات سے خصوصی شغف رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ستاروں کی گردش کے حساب اور اعداد و شمار میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے مختلف اسلامی ممالک میں رویتِ ہلال کے حوالے سے پائے جانیوالے اختلافات پر بحث کی ہے اور ایسے مستند طریقہ کار کی نشاندہی کی ہے جس سے رویت کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے اور اختلافات سے بچا جاسکتا ہے۔
ضیاءالدین لاہوری نے اس معاملے پر خوب بحث کر کے اپنی تحقیق کے نتائج کو اس کتاب کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب کے تعارف میں جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری لکھتے ہیں:

''ضیاءالدین لاہوری صاحب .... نے بڑی محنت اور تحقیق سے رویتِ ہلال کے بارے میں چند الجھے ہوئے گوشوں کو واضح کرنے کی

کوشش کی ہے.........اِن مسائل پر اور ان کے علاوہ دیگر امور پر اُنھوں نے علمی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے سیر حاصل بحث کی ہے اور عالمی اہمیت کی رصدگاہوں کی تحقیقات کی روشنی میں ہماری رہنمائی کی ہے۔ گزشتہ سالوں کی ایسی مصدقہ جدولیں پیش کی ہیں جن کے مطالعہ سے چاند کی رُویت کے بارے میں گزشتہ سالوں میں جو فیصلے کیے گیے ہیں، اُن کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں ہم کسی نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں اور آئندہ کے بارے میں اُن کی تحقیقات سے کافی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اہلِ علم ودانش اُن کی اس کاوش کے لیے تہِ دل سے ممنون ہیں........ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جناب ضیاء الدین لاہوری صاحب کی اس سعی کو منظور فرمائے اور اہلِ علم کو اس سے بھر پور فائدہ اٹھانے کی ہمت مرحمت کرے۔''[۴]

خودنوشت حیات سرسید

یہ کتاب بھی سرسید پر تحقیق سے متعلق ہے۔ اس کتاب میں ضیاء الدین لاہوری نے سرسید کے متعلق تمام کارآمد اور قیمتی معلومات اکٹھی کر دی ہیں۔ انھوں نے نہ صرف سرسید احمد خان کے آثار سے استفادہ کیا بلکہ اس دور کے اخبارات، خودنوشتوں، تقاریر اور خطوط کو بھی کھنگال ڈالا، انھوں نے سرسید کی ایسی خودنوشت تیار کی ہے کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں حیات سرسید کے متعلق جو معلومات پیش کی ہیں وہ بیشتر ایسی ہیں جن سے اردو دنیا بے خبر تھی یا یوں کہہ لیجیے کہ اس ترتیب شدہ انداز سے بے خبر تھی۔ انھوں نے جہاں سرسید کی قومی ملی، علمی اور ادبی خدمات کا تذکرہ کیا ہے وہاں سرسید کی انگریزوں اور انگریزی حکومت کے ساتھ وفاداری اور برطانوی مفادات کی حفاظت کے لیے سرسید کی کاوشوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اس کتاب میں سرسید کی ذات کے بہت سے پہلو نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔ فاضل محقق نے ان تمام معلومات کو بڑی محنت اور عرق ریزی سے اکٹھا کر دیا ہے جو سرسید کی اپنی تحریروں اور اس دور کی کتب اور رسائل میں بکھری ہوئی تھیں۔ انھوں نے اس بکھرے ہوئے مواد کو ایک خاص زمانی ترتیب دے کر پیش کیا

اور ایک عمدہ مفید اور قابلِ قدر تحقیقی کتاب منظرِ عام پر لائے۔ اس کتاب کو پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے سرسید احمد خود اپنی کہانی، اپنے حالات زندگی بیان کر رہے ہیں۔ اس کتاب کے حوالے سے ڈاکٹر تحسین فراقی رقم طراز ہیں:

> ''نہایت بیش قیمت معلومات سرسید کی اپنی تصانیف میں بکھری پڑی تھیں جنہیں یک جا کرنے کا خیال گوشہ نشین، درویش صفت اور بے باک نگار ضیاءالدین لاہوری کو سوجھا اور اُنھوں نے اسے سرسید کی خود نوِشت سوانح کا روپ دے دیا۔ ضیاءالدین لاہوری سرسید کے متخصص کی حیثیت سے اُردو دنیا میں خوب معروف ہیں۔ اُنھوں نے مصلحتوں کی پروا کیے بغیر خود سرسید کی مختلف تصانیف اور اُن کی بعض سوانح سے ریزہ ریزہ معلومات اور اقتباسات چن کر ایک عمدہ اور چشم کشا آپ بیتی کا روپ دیا ہے اور اِس میں ایک ایسی نامیاتی وحدت پیدا کر دی ہے کہ اُن کی اس مسیحائی پر اہلِ ادب کو حیرت ہو گی۔ مجھے یقین ہے کہ جہاں ایک طرف یہ قابلِ قدر تالیف برِاعظم کی اِس انقلاب انگیز شخصیت کے غیر جانب دارانہ مطالعے میں بے حد معاون ہو گی وہیں مجھے اندیشہ ہے کہ سرسید کے بے مغز عشاق اور گنبدِ دستار کے لیے اینٹیں اکٹھی کرنے والے فتویٰ فروش دونوں کو یہ علمی کاوش ایک آنکھ نہیں بھائے گی مگر کیا کِیا جائے، حق تو ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے اور تلخی سے موافقت کیے بغیر تجلی کا ظہور ممکن نہیں ہوتا۔''[۵]

خودنوشت افکار سرسید

ضیاءالدین لاہوری کی یہ کتاب بھی سرسید شناسی کے سلسلے کی کڑی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے سرسید کے حوالے سے اپنے خیالات وافکار کو پیش نہیں کیا بلکہ خود سرسید کے افکار اور خیالات کو پیش کیا اور سرسید کے اپنے افکار کے آئینے میں سرسید کی شخصیت کو قارئین کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے پاکستان، ہندوستان اور برطانیہ کے بڑے بڑے علمی مراکز اور ان اداروں اور اشخاص سے استفادہ کیا جہاں سے انھیں متعلقہ مواد مل سکتا تھا۔ انھوں نے تمام

تحریری سرمائے کا بنظرِ عمیق جائزہ لیا اور پھر افکارِ سرسید کے بکھرے ہوئے حروف چن چن کر یہ تحقیقی شاہکار مرتب کیا جس کا ایک ایک لفظ صداقت پر مبنی ہے اور جسے تحقیق کے کڑے مراحل سے گزار کر قارئین ادب کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب سرسید کے افکار اور ان کی سوانح کا دلچسپ اور حقائق پر مبنی مرقع ہے۔ فاضل محقق نے صحیح اور غلط سے بحث نہیں کی۔ انھوں نے سرسید کے اپنے خیالات وافکار کو جمع کر کے پیش کیا ہے اور سرسید کی شخصیت اور افکار پر خود کسی قسم کا کوئی تبصرہ نہیں کیا ، بلکہ یہ کام قارئین کے لیے چھوڑ دیا ہے کہ وہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد سرسید کے حوالے سے کیا رائے قائم کرتے ہیں۔ اس قابلِ قدر تحقیقی کارنامے کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری لکھتے ہیں:

> ''ضیاء الدین لاہوری کی حیثیت اس عہد کے تمام مؤلفوں اور مصنفوں سے قطعی مختلف ہے۔ اُن کے پیشِ نظر کسی نصابی کتاب کی تالیف نہیں تھی۔ سرسید کے بارے میں اپنے افکار وخیالات کو تالیف کر دینے کے شوق میں اُنھوں نے قلم نہیں اٹھایا۔ تعلیم وتدریس کی کوئی ضرورت اس مشقت کے لیے اُن کی دامن کش نہیں ہوئی تھی۔ اُن کا مقصد سرسید کی عظمت کی تلاش اور اس عہد میں اُن کی معنویت کی دریافت تھی۔ اُنھوں نے غلط اور صحیح سے بحث نہیں کی، جو کچھ ہے سرسید کی اپنی تقریر وتحریر اور الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اُن کی شخصیت کے ہر پہلو، اُن کے افکار وعقائد اور اُن کی سیرت کی ہر جہت اور اُن کی خدمات کے ہر گوشے پر اُن کی اپنی گواہی ہے اور سرسید جیسی عظیم علمی وعملی اور جامع جہات شخصیت کے بارے میں جو کچھ سوچا جا سکتا ہے وہ سب خود نوشت میں موجود ہے۔''[۶]

نقشِ سرسید

ضیاء الدین لاہوری کی یہ کتاب بھی ان کی دوسری کتب کی طرح سرسید شناسی کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس کتاب کے مندرجات کا مقصد سرسید کی ''اصل شخصیت، اصل افکار اور ان کے تحقیقی رنگ، روپ'' کو قارئین کے سامنے لانا ہے۔ اس سے قبل سرسید کی شخصیت اور ان کے

کارناموں پر بہت سی تحریریں لکھی گئیں لیکن وہ ایک خاص ذہنیت کی عکاس تھیں اور ان تحریروں پر ایک فاضل محقق کے بقول ''میڈ ان علی گڑھ'' کی مہر ثبت ہے۔ضرورت اس امر کی تھی کہ سر سید کی ذات کو داستانوی ہیرو کی حیثیت سے متعارف کروانے کی بجائے ان کی حقیقی شکل میں پیش کیا جائے، ان کی شخصیت پر پڑے پردوں کو ہٹایا جائے، تضاد بیانی کو دور کیا جائے اور عقیدت کی عینک اتار کر ان کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے۔اس کام کا بیڑا ضیاء الدین لاہوری نے اٹھایا اور متعلقہ موضوع پر تحقیق کا حق ادا کر دیا۔فاضل محقق سر سید کی شخصیت کا اصل رخ ان کی اپنی تحریروں اور تقریروں کی بنیاد پر سامنے لائے، جو اس معروف شخصیت کی ضد ہے۔سر سید احمد خاں جہاں انگریزی حکومت کی طرف سے انعام واکرام ملنے پر شاداں وفرحاں ہیں وہاں انگریزی حکومت کے استحکام کے خواہشمند بھی ہیں۔فاضل محقق نے اپنی تحقیق کی بنیاد صداقت پر رکھی ہے اور کوئی غیر مستند تحریر اپنی کتاب میں شامل نہیں کی، اس کتاب پر رائے دیتے ہوئے محمد ابراہیم فانی رقم طراز ہیں:

> ''بلاشبہ اِس کتاب میں بعض ایسے حقائق ہیں جو کہ سر سید احمد خاں کے عقیدت مندوں کے لیے تلخ ہیں لیکن حقائق، حقائق ہیں، اُن سے انکار ممکن نہیں اور نہ ہی اِس سے چشم پوشی کر کے اِس کی نوعیت بدل سکتی ہے۔مصنف نے انتہائی عرق ریزی سے اصل مآخذ کی طرف رجوع کیا ہے اور سر سید احمد خاں کے افکار ونظریات کا نقش خود اُن کی تحریرات و مضامین کے حوالے سے پیش کیا ہے۔تحقیق وتنقید اور ریسرچ کے حوالے سے کتاب کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں''۔[۷]

بہادر شاہ ظفر کے شب و روز

ضیاء الدین لاہوری نے جہاں سر سید کے حوالے سے کام کیا وہاں آخری مغلیہ دور کا ہندوستان بھی ان کی تحقیق کا موضوع ہے۔اس سلسلے میں آخری مغل تاجدار **بہادر شاہ ظفر کے شب و روز** بھی ایک اہم تحقیقی کاوش ہے۔مصنف نے اس کتاب کو اس طرح تحریر کیا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کی زندگی کے روز وشب ایک فلم کی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں اور ہم یوں محسوس کرتے ہیں کہ بہادر شاہ ظفر ہمارے سامنے اپنی زندگی کے شب و روز گزار رہے

ہیں۔اس کتاب میں فاضل محقق نے اس دور کے اخبارات، روز ناموں یادداشتوں اور دوسری کتب سے معلومات اکٹھی کر کے اس کتاب میں جمع کر دی ہیں اور یوں آخری مغل تاجدار کی زندگی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

یہ کتاب مغلیہ حکومت کے آخری دور کے حوالے سے اہم معلومات کا خزانہ ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں بیان تو بہادر شاہ ظفر کے حالات کیے ہیں لیکن دراصل یہ مغل اقتدار کے زوال اور خاتمے کی ایک الم ناک داستان ہے۔اس کتاب میں انگریزوں کی سازشوں کا احوال بھی ہے، اپنوں کی بے رخی کی داستان بھی ہے، شاہی دربار کی مملکت کے حالات سے بے خبری اور لاپرواہی کی کہانی بھی ہے اور شہزادوں کی نالائقی اور عیاشیوں کی سچی تصویر بھی۔

اس کتاب میں ہمارے لیے عبرت بھی ہے اور بہت سے سوالات بھی، یہ کتاب ہمیں جھنجھوڑتی بھی ہے اور خوابِ غفلت سے بھی بیدار کرتی ہے۔مغلیہ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے قارئین اور محققین کے لیے یہ کتاب ایک اہم دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔اس کتاب کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار طالب الہاشمی نے اِن الفاظ میں کیا ہے:

> ''مؤلف جناب ضیاء الدین لاہوری نے کتاب کی ترتیب وتدوین میں بڑی تحقیق سے کام لیا ہے اور ایسا شُستہ اور شگفتہ اسلوب نگارش اختیار کیا ہے کہ قاری اس کے اندر جذب ہو جاتا ہے اور اُس کے سامنے اُس دور کا نقشہ اس طرح کھنچ جاتا ہے گویا وہ ایک فلم دیکھ رہا ہو...... کتاب کے دس ابواب ہیں اور اُن کے تحت تقریباً ساٹھ ذیلی سرخیوں میں فاضل مؤلف نے اُس دور کے متعلق نہایت دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے جو عرق ریزی کی ہے، وہ قابلِ تحسین ہے۔مغل سلطنت کے کھنڈر یا نام کے آخری مغل بادشاہ کے دَور کا یہ غایت درجہ دلچسپ تذکرہ نہ صرف ہماری معلومات میں اضافہ کرتا ہے بلکہ عبرت کا درس بھی دیتا ہے۔ یہ کتاب ہر اعتبار سے مطالعہ کے لائق ہے اور کوئی کتب خانہ اس سے خالی نہیں رہنا چاہیے۔''[۸]

سرسید احمد خاں اور ان کی تحریک، نقد و نظر کی میزان میں

ضیاء الدین لاہوری وہ خاص محقق ہیں جن کے پاس سرسید کی تمام تحریریں اور ان کی کتب کے تمام ایڈیشن موجود ہیں۔ یہ ایک ایسا سرمایہ ہے جو شاید کسی اور جگہ موجود نہ ہو۔ انھوں نے عمر بھر متعلقہ موضوع پر تحقیق کی اور بکھرے ہوئے اجزا کو جمع کر کے اپنی تحقیق کو قارئین کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے سرسید پر لکھتے وقت جس دقت نظر اور وسعتِ مطالعہ کا ثبوت دیا اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ انھوں نے حیاتِ سرسید اور ان کی فکر اور کارناموں کے ایک ایک پہلو کا بہ نظر عمیق جائزہ لیا اور نتائج کو اپنی تحقیقی کتب کی صورت میں پیش کیا۔

اس کتاب کے حوالے سے محمد ریاض درانی نے اِن خیالات کا اظہار کیا ہے:

> ''جناب ضیاء الدین لاہوری سرسید احمد پر متخصص کا درجہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے سرسید احمد خاں پر لکھتے ہوئے جس دِقت نظر اور وسعتِ مطالعہ کا ثبوت دیا ہے، وہ اُردو زبان میں اپنی مثال آپ ہے۔ آپ نے سرسید کی زندگی، فکر، کاموں اور کارناموں ہر شے اور ہر شعبے پر دادِ تحقیق دی ہے۔ انھوں نے یہ کام نہ تو کسی یونیورسٹی میں بیٹھ کر کیا ہے، نہ یونیورسٹی کی کسی ڈگری کے حصول کے لیے، اِس کے باوجود اُن کا کام یونیورسٹیوں کے سکالرز کے لیے ایک نمونہ اور معیار بن سکتا ہے اور بننا چاہیے۔'' [9]

آثارِ سرسید

آثار سر سید بھی ضیاء الدین لاہوری کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ انھوں نے سرسید کی شخصیت اور ان کے افکار و خیالات پر تحقیق کی۔ اس کتاب میں محقق نے سرسید احمد خاں کی اپنی تحریروں اور خود نوشتوں کی روشنی میں سرسید کی شخصیت اور افکار کو آشکار کیا ہے اور سرسید کی ذات کا اصل رخ قارئین کے سامنے رکھ دیا ہے۔

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب سرسید کے عشاق کے لکھے ہوئے مضامین کے تحقیقی و تنقیدی جائزے پر مشتمل ہے۔ دوسرے باب میں سرسید کی ذات پر لگائے جانیوالے

الزامات اور ان کی ذات کے حوالے سے موجود مغالطوں کی تردید اور نشاندہی کی گئی ہے۔تیسرے باب میں سرسید کے افکار کو سرسید ہی کی زبان میں پیش کیا گیا ہے جبکہ چوتھے باب میں سرسید اور ان کے ساتھیوں کے ان افکار کو پیش کیا گیا ہے جو خلافِ عقل و دانش بھی ہیں اور دور از کار بھی۔فاضل محقق نے اپنی تحقیق سے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ ان لوگوں کے لیے تو قابلِ قبول نہیں ہیں جو سرسید کی شان میں ہر وقت رطب اللسان رہتے ہیں۔مگر جو بھی بیان ہوا وہ حقائق پر مشتمل ہے اور اس کی تردید ممکن نہیں۔اس کتاب کے حوالے سے ڈاکٹر رؤف پاریکھ کی رائے ہے:

> ''ضیاء الدین لاہوری ایک عجیب شخص ہیں۔انھوں نے سرسید احمد خاں کی زندگی اور اُن کے کارہائے خاص پر تحقیق کو اپنا مقصدِ حیات بنا رکھا ہے۔انھوں نے اُن سینکڑوں کتابوں اور جرائد کی ورق ریزی کی ہے جن میں سرسید احمد خاں کے متعلق کچھ بھی تذکرہ ہے۔ان کی لائبریری میں سرسید کی تمام کتب اور اُن کی مختلف اشاعتیں موجود ہیں۔ان کی زندگی بھر کے اس ولولے کے نتائج پانچ کتابوں کی صورت میں طبع ہو چکے ہیں۔میں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ اُن افراد کی سماعت کے لیے خوشگوار نہیں ہوسکتا جو سرسید کو اعلیٰ سطح کی توقیر کے لائق گردانتے ہیں اور یہ صورتِ حال اس معاشرے میں قطعی عجیب محسوس ہوتی ہے جس کے افراد نے،اس بات سے قطع نظر کہ وہ بہ ہر حال ایک بشر تھے ان کا ایک بُت تراش رکھا ہوا اور اُسے پوجتے ہوں۔''[۱۰]

مغلیہ دہلی کے آخری ایام

مغلیہ دہلی کے آخری ایام بھی ضیاء الدین لاہوری کی اہم کتاب ہے۔اس کتاب میں انھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے واقعات کو مستند حوالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس کتاب کو لکھنے کے لیے انھوں نے یادداشتوں،مضامین،اخبارات،خطوط اور دیگر تحریروں کا وسیع اور عمیق مطالعہ کیا اور ان واقعات و حقائق کو مرتب کیا ہے۔انھوں نے جنگ آزادی کی ابتدا سے لے کر اس کے منطقی انجام اور اس کا حل انگریزی اقتدار تک کے تمام واقعات کو تحقیقی صداقتوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اس کتاب میں اس زمانے کے تمام واقعات ایک تسلسل کے ساتھ قاری کے سامنے آجاتے ہیں اور قاری کو تمام حالات و واقعات کا جائزہ لینے کے بعد اپنی رائے قائم کرنے میں آسانی رہتی ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع کا مکمل احاطہ کرتی ہے اور متعلقہ موضوع پر موجود کتب میں ایک امتیازی شان رکھتی ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے رفاقت علی شاہد رقم طراز ہیں:

> ''معروف محقق اور سرسید شناس ضیاءالدین لاہوری نے دہلی میں جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا سلسلہ واقعات مرتب کر کے زیرِ نظر کتاب میں پیش کیا ہے۔ تمام واقعات تک ممکن دسترس حاصل کرنے کے لیے انھوں نے یادداشتوں اور دیگر مضامین اور تحریروں سے بھی مواد حاصل کیا ہے.......اِس کتاب میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران دہلی میں شورش کے آثار پیدا ہونے سے لے کر جنگِ آزادی کے منطقی اختتام تک کے واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مرتب نے مختلف عناوین قائم کر کے متعلقہ بیانات حوالے کے ساتھ درج کر دیے ہیں۔ اِس سے بہ یک نظر تمام واقعات ایک سلسلے کے تحت قاری کے سامنے آجاتے ہیں۔ اس طرح ایک طرف تو تمام متعلقہ مواد تک رسائی آسان ہوگی اور دُوسری طرف قاری کو مجموعی صورتِ حال سے آگاہ ہو کر صحیح تاثر قائم کرنے میں آسانی ہوتی ہے'' [۱۱]

۱۸۵۷ء کے چند اہم کردار

یہ کتاب ضیاءالدین لاہوری کی تحقیقی کاوشوں کا ایک اور خوبصورت ثمر ہے۔ یہ کتاب مسلمانانِ ہند کی سیاسی تاریخ کے ایک اہم ترین واقعے کے حوالے سے ہے، اس سانحے کے حوالے سے ہے جس سے ہندوستان سے کئی صدیوں پر محیط مسلم اقتدار کا خاتمہ ہوا اور انگریزی فوج ہندوستان کے سیاہ وسفید کی مالک بن گئی۔ اس کتاب میں فاضل محقق نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے ان حالات و واقعات کو نقل کیا ہے جنھوں نے اس سانحے کے ظہور پذیر ہونے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اُن شخصیات اور اُن کے بیانات کو بھی کتاب کا حصہ بنایا ہے

جنھوں نے اس سانحے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ان شخصیات میں مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی صدرالدین آزردہ، مولوی سید امداد العلی، سرسید احمد خان اور منشی رجب علی شامل ہیں۔

اس کتاب کے مصنف کا مطالعہ بے حد وسیع ہے اور انھوں نے لفظ، لفظ جمع کر کے ان کا کامل تحقیقی جائزہ لے کر یہ کتاب لکھی ہے اور قارئین کے سامنے متعلقہ موضوع پر فکر و فن کے نئے دریچے وا کیے ہیں۔ یہ کتاب ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے حوالے سے ایک مستند دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے رفاقت علی شاہد لکھتے ہیں:

> ''اُردو ادب میں حوالہ جاتی مواد کی شدید کمی ہے۔ ادبی شخصیات کی حد تک شُعرا اور نثر نگاروں کے قدیم تذکرے یہ کمی کسی نہ کسی حد تک پوری کر دیتے ہیں لیکن تاریخی و تہذیبی شخصیات کے بارے میں معلومات اِس سے بھی بہت کم ملتی ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں ایسی ہی پانچ شخصیات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کتاب ہٰذا میں جن شخصیات پر مضامین شامل کیے گیے ہیں، وہ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر شامل رہی ہیں۔ جنگ آزادی کے حوالے سے اِن شخصیات کی ادبی حیثیت بھی اہم ہے۔ اِن شخصیات میں مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی صدرالدین آزردہ، مولوی سیّد امداد العلی، سرسید احمد خاں اور منشی رجب علی شامل ہیں۔ مصنف نے مشمولہ مضامین میں عموماً یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ وہ معاصر مآخذ سے بیانات، ترتیب اور موقع محل کی مناسبت سے نقل کر کے نتائج اخذ کیے بغیر فیصلہ قاری پر چھوڑ دیتے ہیں۔''[۱۲]

کتابیاتِ سرسید

ضیاء الدین لاہوری کی تحقیق کا محور و مرکز سرسید احمد خان کی ذات، ان کی تحریریں اور افکار و خیالات ہیں۔ انھوں نے اپنے قیامِ لندن ۱۹۷۰ء تا ۱۹۹۷ء کے دوران، لندن کے معروف علمی مراکز انڈیا آفس لائبریری، برٹش میوزیم لائبریری، رائل ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری اور

لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز کی لائبریریوں میں سرسید کی بہت سی کتب کے اولین ایڈیشن دیکھے اور ان کا مطالعہ کیا اور اپنی تحقیق کے نتائج اپنی تحقیقی کتب کی صورت میں پیش کیے۔

اس کتاب میں فاضل محقق نے لندن کی لائبریریوں میں موجود سرسید احمد خان کی کتب (مطبوعہ و غیر مطبوعہ) کا سرسید کے تراجم اور بعض قدیم اشاعتوں کے سرِ ورق بھی شامل کیے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور ان میں شائع شدہ تحریروں کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ ان کے خطوط، تقاریر کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے خطوط، تقاریر کے مجموعوں اور تحریروں کے انتخابات کو بھی شامل کیا ہے۔ فاضل محقق نے سرسید کی کتب کے جملہ ایڈیشنوں کا احاطہ کر کے انھیں ان کتابیات میں شامل کیا ہے۔ بہت سی کتب کے اولین ایڈیشنوں کے سرورق کے عکس بھی دیے گیے ہیں۔ فاضل محقق نے یہ اشاریہ بڑی محنت اور عرق ریزی سے ترتیب دیا ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ''جناب ضیاء الدین لاہوری شاید اُردو کے واحد محقق ہیں جنھوں نے مختلف موضوعات پر مغز کھپائی کرنے کی بجائے صرف ایک موضوع کو تاریخ اور زمانے کی گہرائیوں سے تلاش کرنے کا فریضہ اختیار کر رکھا ہے اور یہ موضوع ہے ''سرسید احمد خان''....... ضیاء الدین لاہوری کو کچھ عرصے کے لیے لندن میں قیام کا موقع ملا تو انھوں نے انڈیا آفس لائبریری، برٹش میوزیم، رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور لندن یونیورسٹی کے سکول آف اورینٹل سٹڈیز کی لائبریریوں میں سرسید کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا اور مطلوبہ مواد جمع کیا۔ زیرِ نظر کتاب کا عنوان کتـــابیـــاتِ سرسید ہے اور اِس میں متذکرہ بالا اداروں سے حاصل کی گئی معلومات کی روشنی میں سرسید کی کتابوں کا ایک مستند اشاریہ تیار کیا گیا ہے۔ فاضل محقق نے یہ کتابیں زمانی ترتیب سے پیش کی ہیں تا کہ اہلِ نظر سرسید کی ذہنی اور فکری تبدیلیوں کا اندازہ لگا سکیں۔ اتنی جامع اور مستند کتابیاتِ سر

سید پہلے شائع نہیں ہوئی اور فاضل مؤلف کی محنت ہر لحاظ سے قابلِ تعریف ہے۔[۱۳]

مختصر سالانہ تقابلی تقویم

ضیاء الدین لاہوری کا یہ کتابچہ بھی تقویم کے حوالے سے ہے۔ اس کتابچے میں بڑے اختصار کے ساتھ ۵۶۹ء سے ۲۱۰۰ء تک ہر سال کے یکم محرم کی متبادل عیسوی تاریخ، دن، مہینے اور سال کے تعین کے ساتھ دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مقابل صفحات پر ان عیسوی سالوں کی یکم جنوری کی متبادل قمری تاریخیں دن مہینے اور سال کے ساتھ دی گئی ہیں۔ اس کتاب کے حوالے سے جاوید اختر بھٹی نے اِن خیالات کا اظہار کیا ہے:

> ''ضیاء الدین لاہوری کے دو پسندیدہ موضوعات ہیں ایک ''سرسید احمد خاں'' اور دوسرا ''تقویم''۔ ان دونوں موضوعات پر انھوں نے بہت سا کام کیا ہے۔ حال ہی میں ان کا کتابچہ مختصر سالانہ تقابلی تقویم (۵۶۹ء عیسوی تا ۲۱۰۰ء عیسوی) شائع ہوا ہے....... اب محققین کے لیے متبادل تاریخ تلاش کرنا مشکل نہیں رہا۔ ضیاء الدین لاہوری نے مشکل کام کو آسان اور مختصر کر دیا۔ یہ کتابچہ جہاں محققین کے لیے مفید ہے، وہاں عام لوگوں کے بھی کام آ سکتا ہے۔ امید ہے کہ **مختصر تقویم** کو پذیرائی حاصل ہوگی۔''[۱۴]

ضیاء الدین لاہوری کی تحقیقی کتب کا تعارفی جائزہ لینے کے بعد ہم یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے سرسید احمد خاں، آخری مغلیہ دور کے ہندوستان اور تقویم کے حوالے سے گراں قدر تحقیقی کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ انھوں نے اپنی تحقیق کی بنیاد صداقت پر رکھی اور اصل مآخذ تک رسائی حاصل کر کے، ان کا مطالعہ کر کے صحیح ترین نتائج اخذ کیے۔ ان کی تحقیق مستند ترین حقائق پر مشتمل ہے جن کو رد کرنا یا ان سے انکار کرنا ممکن نہیں۔

ڈاکٹر زاہد منیر عامر صاحب کا شکر یہ مجھ پر واجب ہے کہ ان کی راہ نمائی قدم بہ قدم میرے شاملِ حال رہی۔ ضیاء الدین لاہوری صاحب اور پروفیسر امجد علی شاکر صاحب کے توسط

سے مجھے اصل حوالوں تک رسائی حاصل ہوئی میں ان کا تہہ دل سے احسان مند ہوں۔

میں اپنے دوستوں ڈاکٹر قاسم محمود احمد، ڈاکٹر محمد راشد ارشد منہاس، پروفیسر رانا حسین ناہر اور پروفیسر نبیل مشتاق کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی مدد سے یہ کتاب منظرِ عام پر آئی۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا کرے

آمین

24۔جنوری،2017ء

مجاہد حسین
0300-8199619

حوالہ جات

۱۔ محمود الحسن، روزنامہ ایکسپریس، لاہور: ۱۵ دسمبر ۲۰۱۰ء ص ۱۲

۲۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری، مقدمہ، سرسید کی کہانی، ان کی اپنی زبانی ۔ ضیاء الدین لاہوری، لاہور: جمعیۃ پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء ص ۳۵۔۳۴

۳۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، تعارف کتاب، جوھر تقویم، ضیاء الدین لاہوری، لاہور: جمعیۃ پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۷

۴۔ پیر جسٹس محمد کرم شاہ الازہری، تعارف کتاب، رویت ھلال موجودہ دور میں، ضیاء الدین لاہوری، لاہور: ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء ص ۶۔۷

۵۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، حرفے چند، خود نوشت حیات سر سید، ضیاء الدین لاہوری، لاہور: جمعیۃ پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء ص ۲۴

۶۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری، حرفِ چند، خود نوشت افکارِ سر سید، لاہور: جمعیۃ پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص ۱۷۔۱۶

۷۔ محمد ابراہیم فانی،، ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک: جون ۱۹۹۹ء ص ۷

۸۔ طالب الہاشمی، بیدار ڈائجسٹ، لاہور: فروری ۲۰۰۳ء، ص ۴۲

۹۔ محمد ریاض درانی، عرضِ ناشر، سرسید اور ان کی تحریک نقدونظر کی میزان میں، ضیاء الدین لاہوری، لاہور: جمعیۃ پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۱۱

۱۰۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ، روزنامہ ڈان، کراچی: ۱۹ فروری ۲۰۰۸ء

۱۱۔ رفاقت علی شاہد، مشمولہ سہ ماہی صحیفہ لاہور: جنوری تا جون ۲۰۰۷ء، ص ۳۴۸، ۳۴۷

۱۲۔ رفاقت علی شاہد، مشمولہ سہ ماہی صحیفہ لاہور: جنوری تا جون، ۲۰۰۷ء، ص ۳۴۵، ۳۴۶

۱۳۔ ڈاکٹر انور سدید، روزنامہ، نوائے وقت، لاہور: ۱۵ فروری ۲۰۰۹ء

۱۴۔ جاوید اختر بھٹی، ماہنامہ، **ختم نبوت**'' ملتان: اکتوبر ۲۰۰۹ء، ص ۴۹، ۵۰

سرسید کے نام غالبؔ کا حالیہ مکتوب

پروفیسر امجد علی شاکر

مولوی سرسید احمد خاں، کہو کیسے ہو!........

.......ان دنوں تمھارے ایک محقق کا بہت شہرہ سنا ہے۔ نام ضیاءالدین ہے اور لاہوری نسبت رکھتے ہیں۔ ضیاءالدین نیّر یاد آتے ہیں، ان سے ملاقات کو ایک مدت گزر گئی۔ ضیاءالدین لاہوری سے ملاقات ہوئی تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اس مردِ خوش خصال نے تمھاری ایک ایک کتاب ہی نہیں، ایک ایک ورق سنبھال رکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پاک و ہند کے کسی اور کتب خانے کا تو کیا ذکر، خود تمھارے بنائے ہوئے دارالعلوم میں بھی یہ کتابیں یک جا نہ مل سکیں گی۔ تمھاری ایک ایک کتاب کی متعدد اشاعتیں ان کے ہاں محفوظ ہیں۔ تمھارے رسائل میں شائع شدہ مضامین کی نقول، تمھارے بارے میں طبع ہونے والی کتب اور رسائل، تمھارے مخالفوں کے شور و شر کا ذخیرہ، تمھارے مدّاحوں کی مدّاحی کیا، بھٹّی تک لفظ لفظ محفوظ۔ تمھاری کتب کی پہلی اشاعتیں بہم پہنچانا کیا جان جوکھوں کا کام تھا، سو یہ عزیز یہ خدمت بجالایا۔ تمھاری ہر کتاب کی پہلی اشاعت کے سرِ ورق کی نقل خصوصیت سے محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ اب تمھارے بارے میں ایک کتاب نامہ مرتّب کر رہا ہے۔ اس کتاب میں یہ نقول عام کی جائیں گی۔ جو چاہے گا سو دیکھے گا کہ تمھاری کتب کے سرِ ورق کتنے بھدے اور اناڑی ہاتھوں کے بنائے ہوئے تھے۔ ان دنوں کتابیں چھپتی ہیں تو مصور کے موٹے قلم سے بنے سرِ ورق کتاب کی زینت ہوتے ہیں۔ ایسے سرِ ورق دیکھنے والی آنکھیں تمھاری کتابوں کے سرِ ورق دیکھیں گی تو تم پر نفرین بھیجیں گی۔

ضیاءالدین لاہوری عجیب مردِ کمال اور خوش خصال ہے۔ خاطر تواضع میں یوں دل کھول کر خرچ کرتا ہے کہ اس کی کشادہ دستی پر رشک آتا ہے۔ یہ نوجوان خندہ جبینی سے ملتا اور

کشادہ دلی سے تواضع کرتا رہا۔اس کی کتب کا کمرا دیکھا تو خستہ و درماندہ۔ جسے میں اس کی کشادہ دستی کا کرشمہ خیال کر رہا تھا، دراصل وہ اس کی کشادہ دلی کا نتیجہ ہے۔تمھارے بارے میں اس کی کشادہ دلی دیکھ کر میں تو حیرت زدہ ہو رہا اس کی باتیں سنا کیا۔ہم سمجھتے تھے کہ تمھارے بارے میں ہر بات جانتے ہیں،مگر اس کے سامنے تو سوائے خاموشی کے چارہ نہ رہا۔اسے تمھاری ہر بات یاد کیا،نوکِ زبان تھی۔ایسا عاشق کسی کو کب ملا ہوگا! ہاں، لیلیٰ کو مجنوں، شیریں کو فرہاد اور عذرا کو وامق ملا ہو تو الگ بات ہے۔سنا ہے، یہاں پنجاب میں بھی ہیر رانجھے وغیرہ کے قصہ ہائے عشق خاصے معروف ہیں۔ ہوں گے، ہمیں تو ایران توران ہی یاد آتے ہیں۔ پنجاب سے ہمیں ایک مدت ہر بات پر ٹکا سا جواب ملتا رہا۔سنا ہے کہ انیس ناگی نامی ایک باغی نوجوان نے ہماری درخواستوں اور ان پر صادر ہونے والے احکام، اہل کاروں کی آرا اور تمام کاروائیاں دفتر و دیوان سے نکال کر کتاب میں چھاپ دی ہیں۔اس کا مذاق ٹھہرا، ہماری آبرو گئی۔ یوں تو ہمارے عہد میں بھی باغی نوجوان ہوتے تھے۔ ویسے ہم خود کچھ کم نہ تھے۔لوگ ہمیں باغی نوجوان ہی کہتے تھے،مگر ہم یوں کسی کی آبرو کو نہیں آتے تھے۔اگلے وقتوں کے اچھے لوگوں کی مدح میں بخل نہ کرتے تھے اور جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے تھے، انھیں کچھ نہ کہنے کو اپنا طریق ٹھہرایا تھا، مگر یہ انیس ناگی تو ہماری جان کو لاگو ہو گیا ہے۔کیا کریں، دنیا میں تو ایسی حالت میں ہم یہ کہ کر چپ ہو جاتے تھے:

قصہ ضیاء الدین لاہوری کا ہو رہا تھا اس نے تمھارے بارے میں سات کتابیں لکھ رکھی ہیں۔ان میں ہر بات با حوالہ ہے کوئی بات بھی ایسی نہیں کہ بے پر کی اڑائی لگتی ہو۔ ہر بات ثقہ و معقول۔ان دنوں یار لوگوں نے تمھیں مجاہدِ آزادی یعنی سرکار کا باغی مشہور کر رکھا ہے۔تم جیسے سرکار کے نمک حلال اور نجیب شخص کے بارے میں کیا افترا باندھا ہے ہم تم سدا سرکار کی دولت اور اقبال کو دعائیں دیتے رہے۔ چاہا کہ جب تک زمین ساکن اور آسمان دائر ہے، تب تک سرکارِ انگلشیہ کا عہدِ ہمایونی قائم و سلامت رہے۔ان لوگوں نے خواہ مخواہ کا طومار باندھ رکھا ہے کہ تم آزادی خواہوں کے سرخیل تھے۔ ہے ہے، خدانکردہ تم ایسا کیوں ہونے لگے؟ تلنگوں اور نمک حراموں میں تم کیوں کر شامل ہو سکتے ہو۔تم ٹھہرے شریف و نجیب، معزز و معتبر، سرکار کے وظیفہ خوار، دربار میں کرسی نشیں، وائسرائے کے حاشیہ نشیں، حضور گورنر صاحب بہادر سے میل جول، ملاقات، بلکہ دوستی ، بڑے بڑے افسرانِ سرکار سے تمھارا تعلق، بڑے بڑے حاکمانِ یورپ

تمھارے خیر خواہ، اس پر یہ اتہام کہ تم آزادی خواہوں میں شامل تھے، سرکارِ برطانیہ کو یہاں سے چلتا کرنا چاہتے تھے۔ لاحول ولاقوۃ! لوگ بھی کیا کیا تہمتیں تراشتے ہیں۔ اب اعمال کی تہمتیں کم ہیں کہ کچھ ان کی بھی سہی۔ شکر کرو، ضیاء الدین سا مردِ جری پیدا ہوا جس نے تمھارا دامن ان دھبوں سے دھویا اور تمھیں خلق اور خالق کے سامنے سُرخرو کیا۔ حاکموں میں عزت بچی، ہم چشموں میں آبرو رہی، دوستوں میں وقار رہا، کم اصلوں اور اجلافوں میں حرمت پامال نہ ہوئی۔ اسے دعائیں دو کہ یہ تمھارا محسن ہے۔ تمھیں کتنی تہمتوں سے بچایا اور تمھاری عزت کو لوٹایا۔ خدا اس کی آبرو محفوظ رکھے۔

آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہم محققین کے نام سے کان کو ہاتھ لگاتے تھے۔ ایک صاحب محقق نے یہ مضمون باندھا کہ اردو میں دو بڑے ٹرباز ہیں، میر اور غالب۔ میر کے ساتھ نام آنے پر یک گونہ خوشی بھی ہوتی ہے، لیکن مرنے پیچھے ٹرباز کہلانا کون شریف آدمی برداشت کرے گا۔ اپنی آبرو جانے کا دکھ تو ہر کسی کو ہوتا ہے، سو مجھے بھی ہوا، مگر میر کی بے وقاری بھی دیکھی نہ گئی۔ خدا کا شکر بجالایا یہ سب کچھ دیکھنے کو دنیا میں زندہ نہ رہا تھا۔ تب سے اب تک محقق کا لفظ سنتے ہی ہاتھوں میں رعشہ آجاتا ہے۔ ضیاء الدین لاہوری طرحِ جدید کے محقق ہیں۔ کسی کی آبرو کو لاگو نہیں ہوتے، بلکہ کھوئی آبرو بحال کرنے کا سروسامان کرتے ہیں۔ خدا انھیں جیتا رکھے۔ بتاتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی دلّی میں ہونے والی دارو گیر کے پُرآشوب دنوں کا تذکرہ بھی لکھے بیٹھے ہیں۔ خدا انھیں نظرِ بد سے بچائے........

باب اوّل

سرسید شناسی کی روایت

سرسید احمد خاں ۱۸۱۷ء میں دہلی کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم وتربیت بھی دہلی میں ہوئی۔ وہ مستقل مزاج اور آہنی عزم کے مالک تھے۔ انھوں نے نائب میرمنشی کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اور ترقی کر کے جج کے منصب جلیلہ تک جا پہنچے۔ انھیں جوادالدولہ، عارف جنگ اور سی۔ ایس۔ آئی کے خطابات سے نوازا گیا۔ اردو نثر کے لیے ان کی ادبی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ان کی کوششوں سے اردو نثر حقیقت نگاری کے لطف سے آشنا ہوئی اور اردو نثر نے اپنے ارتقا اور ترقی کی منازل بڑی سرعت سے طے کیں۔ انھوں نے نہ صرف خود اردو نثر کے فروغ کے لیے کام کیا بلکہ اپنی سحر انگیز شخصیت کے حصار میں اور بھی کئی رفقا کو لیا اور اردو نثر کے دامن کو وسعت بخشی۔

سرسید احمد خان کی کتاب **آثار الصنادید** ۱۸۴۷ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں انھوں نے دہلی کی مشہور شخصیات، قدیم تاریخی عمارات اور مقامات کا مفصل حال بیان کیا۔ اس کے بعد ان کی ایک اور اہم کتاب **اسباب بغاوت ہند** ۱۸۵۹ء میں سامنے آئی۔ اس کتاب میں انھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ کی آزادی کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر بیان کیا ہے۔ اپنی کتاب **خطباتِ احمدیہ** میں انھوں نے سر ولیم میور کی کتاب "Life of Muhammad" میں نبی کریمؐ کی ذاتِ گرامی پر اٹھائے گئے اعتراضات کے کامیاب اور مدلل جوابات دیے۔ اپنی ایک اور کتاب **تبیین الکلام** میں انھوں نے قرآن کریم اور انجیل کے مشترک مضامین پیش کیے۔ بعدازاں انھوں نے قرآن مجید کی تفسیر **تفسیر القران وھو الھدیٰ والفرقان** کے نام سے لکھنا شروع کی۔ یہ تفسیر ابھی مکمل نہ ہوئی تھی کہ وہ اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔ اِن کے علاوہ بھی ان کی بہت سی تحریریں منظرِ عام پر آئیں۔

۱۸۷۰ء میں سرسید کا ایک اور اہم کارنامہ رسالہ **تہذیب الاخلاق** کا اجرا تھا۔ اس رسالے نے بھی اردو نثر کے فروغ میں بہت اہم کردار ادا کیا اور اردو نثر کے دامن کو مضامین نو سے مالا مال کر دیا۔ اس رسالے میں انھوں نے مذہبی، تعلیمی، قومی، سیاسی، اور معاشرتی مسائل پر خود بھی لکھا اور اپنے رفقا سے بھی لکھوایا اور مسلمانانِ ہند کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا۔

سرسید احمد خاں نے اپنی مختلف کتب، مضامین اور تقاریر وغیرہ کے ذریعے یہ کوشش کی کہ انگریزی حکومت اور مسلمانوں کے مابین فاصلے کم ہوں اور دونوں ایک دوسرے کو سمجھ سکیں اور ایک دوسرے کے قریب آسکیں۔ اس کوشش میں انھوں نے بہت سی ایسی باتیں بھی لکھیں اور کہیں کہ جس میں مسلمانوں کو انگریزی حکومت کا وفادار غلام بنانے کا درس اور سبق دیا تھا۔

سرسید احمد خاں نے اپنے دور کے حالات کا بنظرِ عمیق جائزہ لیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانانِ ہند کی حالت میں اس وقت تک بہتری نہیں آسکے گی جب تک کہ مسلمان جدید مغربی علوم حاصل نہ کرلیں۔ لہٰذا انھوں نے مسلمانوں کو جدید علوم سے روشناس کرانے کے لیے علی گڑھ میں ایک سکول کی بنیاد رکھی جہاں مسلم نوجوانوں کو جدید مغربی تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جاتا تھا لیکن اس ادارے میں انگریزی اساتذہ اور انگریزی حکومت کی بے جا مداخلت اور اثر ورسوخ اور خود سرسید کی پالیسیوں کی وجہ سے مسلم نوجوانوں کو جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی حکومت سے وفاداری اور تابع فرمائی کی ترغیب وتلقین بھی کی جاتی تھی۔ گو اس ادارے میں مذہبی تعلیم کا بندوبست کیا گیا تھا مگر برائے نام۔ بعد میں یہ سکول کالج کے درجے تک پہنچا۔ اس ادارے نے سرسید کے عہد میں جدید مغربی علوم کو مسلم نوجوانوں تک پہنچانے کا کام کیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے اندر انگریزی حکومت سے وفاداری کے جذبات بھی پیدا کیے۔

سرسید احمد خاں کے زمانے ہی میں بہت سے لوگ انھیں ایسے میسر آئے جو اُن کے ممدومعاون بنے اور ان کے نظریات کے فروغ میں ان لوگوں نے سرسید کا ساتھ دیا۔ بہت سے صاحبان ایسے بھی تھے جنھوں نے سرسید احمد خاں کا اس لیے ساتھ دیا کہ وہ مسلمانوں کی خیرخواہی اور دنیاوی ترقی کی بات کرتے تھے لیکن جب انھوں نے سرسید کے خیالات ونظریات کو پوری طرح سمجھا اور خصوصاً ان کے مذہب سے متعلق نظریات کو جانا تو ان سے گریزپا ہوگئے۔ ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس نے ابتدا ہی سے سرسید احمد خاں کے کام، ان کے طریقہ کار اور ان کے نظریات

سے اختلاف کیا اور سختی سے اپنے مؤقف پر آخر تک قائم رہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرسید احمد خاں کو تینوں طبقوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بھی جنھوں نے عزت وتوقیر کے اونچے سنگھاسن پر بٹھایا ۔جنھوں نے بعض اقدامات کی تائید وحمایت کی اور بعض اقدامات کی مخالفت کی اور ایک گروہ ایسا بھی تھا جس نے اوّل تا آخر سرسید احمد کے اقدامات کی مخالفت کی اور ان کے مشن اور ان کے نظریات کو نہ صرف تسلیم نہ کیا بلکہ کھلے لفظوں میں اس کی مذمت بھی کی۔ یہ تینوں طبقے آج بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔ سرسید کے پیروکار بھی، صرف اچھے کاموں کی تحسین اور غلط اقدامات پر تنقید کرنے والے بھی اور ایسے لوگ بھی موجود ہیں جنھوں نے سرسید کی ذات اور ان کے افعال کو ہمیشہ شکوک وشبہات کی نگاہ سے دیکھا۔

سرسید کے حوالے سے اظہار خیال کا سلسلہ ان کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ جہاں ان کے حق میں بہت کچھ لکھا گیا وہاں انھیں ان کے نظریات کی وجہ سے ہدفِ تنقید بھی بنایا گیا۔ ایک طرف حالی تھے تو دوسری طرف اودھ پنچ سے وابستہ لکھنے والے تھے۔ وہیں علامہ شبلی نعمانی بھی تھے جنھوں نے غلط مذہبی نظریات پر سرسید کی گرفت کی مگر دلائل کے ساتھ۔ سرسید کی ذات، ان کے مقاصد اور ان کے نظریات کے حوالے سے اظہارِ خیال کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ آئندہ صفحات میں اسی حوالے سے بات کی جائے گی کہ سرسید کے حوالے سے صاحبانِ علم ودانش نے کن خیالات کا اظہار کیا اور مختلف ادوار نیز ہندوستان کے طول وعرض سے تعلق رکھنے والی شخصیات نے سرسید احمد خاں کے مشن اور ان کے نظریات کے حوالے سے کس قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم ان اصحاب کی سرسید احمد خاں کی ذات اور ان کے مشن کے حوالے آرا کا جائزہ لیں گے جن کا سرسید احمد خاں کے ساتھ بہت قریبی تعلق رہا اور جنھیں رفقائے سرسید کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا الطاف حسین حالی کا نام سرفہرست ہے۔

مولانا الطاف حسین حالؔی سرسید احمد خاں کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ انھوں نے سرسید کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر ایک مفصل کتاب حیاتِ جاوید کے نام سے تصنیف کی۔ اس کتاب میں انھوں نے ایک طرف تو سرسید احمد خاں کی شخصیت کے متعلق لکھا اور دوسری طرف ان کے کارناموں پر بھی روشنی ڈالی۔ ناقدین نے اسی کتاب کو سرسید کی ''مدلل مداحی'' بھی قرار دیا۔ اس کتاب کے حوالے سے تاریخ ادب اردو کے مصنف رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

''حیاتِ جاوید، حالی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ کتاب ہے جس کی وجہ سے انھوں نے حیاتِ ابدی پائی۔ یہ ایک بہت مفصل اور جامع کتاب ہے۔ اس میں سرسید مرحوم کی طویل اور کثیر الاشغال زندگی کے حالات تفصیل کے ساتھ درج ہیں —— یہ ایک مہتم بالشان تصنیف ہے لیکن اس میں ہیرو کی تعریف میں مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے مولانا شبلی کا یہ اعتراض بالکل صحیح ہے کہ اس کتاب میں تصویر کا صرف ایک رخ دکھایا گیا ہے''۔[۱]

اس کتاب میں مولانا حالی لکھتے ہیں کہ سرسید نے ہم پر بہت سے احسانات کیے ہیں۔ ان میں سے ایک احسان یہ بھی تھا کہ انھوں نے یہ سبق دیا کہ اب ہمیں دنیا میں محکوم بن کر رہنا ہے اس لیے وہ لیاقتیں اور صلاحتیں جو دنیا میں کشور کشائی اور حکومت وسلطنت کے لیے درکار ہیں ہمارے لیے بے سود ہیں لہٰذا اب ہمیں محکوم بن کر رہنا سیکھ لینا چاہیے۔ مولانا حالی کے خیال میں یہ سرسید احمد خاں کا مسلمانوں پر بہت بڑا احسان ہے وہ حیاتِ جاوید میں لکھتے ہیں:

''سرسید احمد خاں مرحوم کے جہاں ہم پر اور بہت سے احسانات ہیں، اُنہی میں سے ایک بہت بڑا احسان یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے ایک ایسی بے بہا زندگی کا نمونہ چھوڑ گئے ہیں جس سے بہتر ہم اپنی موجودہ حالت کے موافق کوئی نمونہ قوم کی تاریخ میں نہیں پا سکتے۔ اگر چہ ہماری قوم میں بڑے بڑے اولوالعزم بادشاہ، بڑے بڑے دانشمند وزیر اور بڑے بڑے بہادر سپہ سالار گزرے ہیں مگر اُن کے حالات اس کٹھن منزل میں، جو ہم کو اور ہماری نسلوں کو درپیش ہے، براہ راست کچھ رہبری نہیں کر سکتے۔ ہم کو اب دنیا میں محکوم بن کر رہنا ہے اور اس لیے وہ لیاقتیں، جو سلطنت اور کشور کشائی کے لیے درکار ہیں، ہمارے لیے بے سود ہوں گی۔''[۲]

مولانا حالی آگے چل کر لکھتے ہیں کہ علی گڑھ محمڈن کالج کے طلبہ کو انگریزوں کی اطاعت وفرماں برداری کا درس دیا جاتا ہے، اور اطاعت وفرماں برداری کی جو مشق اس ادارے میں کروائی جاتی ہے اس کی مثال ہندستان بھر کے کسی اور ادارے میں نہیں ملتی۔ اس کے ساتھ ساتھ مولانا حالی اس کتاب میں یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ علی گڑھ کالج کے طلبہ کی تعلیمی کارکردگی کبھی بھی قابل

رشک نہیں رہی۔اس کالج کے طلبہ نے آج تک فضیلت اور علمی لیاقت میں دوسرے کالجوں کے طلبہ پر کوئی واضح فوقیت اور برتری حاصل نہیں کی اور نہ ہی یونیورسٹی کے نتائج یہ بتاتے ہیں کہ اس کالج کے طلبہ نے امتحانات میں دوسرے کالجوں کی نسبت زیادہ کامیابیاں حاصل کی ہوں۔لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر اور اس سے مفید تر کوئی اور ادارہ موجود نہیں۔

مولانا حالی گو سرسید کے بڑے خیر خواہ تھے لیکن انھوں نے سرسید کے مذہبی نظریات پر نکتہ چینی بھی کی ہے۔خصوصاً انھوں نے سرسید احمد خاں کی لکھی ہوئی قرآن مجید کی تفسیر پر اعتراضات اٹھائے۔مولانا حالی کے ان اعتراضات کی جھلک حیات جاوید میں بھی موجود ہے اور مقالاتِ حالی میں بھی انھوں نے اس حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔اس حوالے سے مولانا حالی حیاتِ جاوید میں لکھتے ہیں:

''آخر میں سرسید کی خود رائی یا جو وثوق کہ ان کو اپنی آرا پر تھا، وہ حد اعتدال سے متجاوز ہو گیا تھا۔بعض آیات قرآنی کے وہ ایسے معنی بیان کرتے تھے جن کو سن کر تعجب ہوتا تھا کہ کیونکر ایسا عالی دماغ آدمی ان کمزور اور بودی تاویلوں کو صحیح سمجھتا ہے! ہر چند کہ ان کے دوست ان تاویلوں پر ہنستے تھے مگر وہ کسی طرح اپنی رائے سے رجوع نہ کرتے تھے۔''[۳]

مولانا حالی نے سرسید احمد خاں کی لکھی ہوئی تفسیر کے حوالے سے اپنے مقالات میں بھی اعتراضات اٹھائے ہیں ان کے خیالات ملاحظہ ہوں:

''بہت سے مقامات ان کی تفسیر میں ایسے بھی موجود ہیں جن کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایسے عالی دماغ شخص کو کیونکر ایسی تاویلات واردہ پر اطمینان ہو گیا اور کیونکر ایسی فاش و فحش غلطیاں ان کے قلم سے سرزد ہوئی ہیں!''[۴]

علامہ شبلی نعمانیؒ کا نام اردو ادب کے قارئین کے لیے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔آپ سوانح نگار، نقاد، شاعر، عالم دین، ماہر تعلیم، سفر نامہ نگار، خطیب، معلم، مکتوب نگار، مقالہ نگار، سیرت نگار اور مورخ ہیں۔علامہ شبلی نعمانی کا بھی سرسید احمد خاں کے ساتھ بہت قریبی تعلق رہا۔ابتدا میں وہ بھی سرسید کی طرح جدت پسند تھے اور عقلیت کا ان پر غلبہ تھا لیکن سرسید احمد خان کے

ساتھ طویل عرصہ گزارنے کے بعد آہستہ آہستہ وہ سرسید کے خیالات سے اختلاف کرنے لگے اور بعد ازاں یہ اختلافات بڑھتے گئے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی رقم طراز ہیں:

> ''شبلی جو سرسید کے گروہ کے ایک نامور بزرگ اور بقول شرران کی فوج کے ایک نامی گرامی پہلوان سمجھے جاتے تھے۔ ابتدا میں وہ بھی سرسید کی طرح جدت پسند تھے لیکن سرسید احمد خاں کی ساڑھے چودہ سالہ صحبت نے ان کے ذہن کو تبدیل کر دیا۔ وہ جدت پسندی کی تنگ نائے سے نکل آئے ——— سرسید کی مغرب زدگی ان کو اپنے رنگ میں رنگنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔''[۵]

سرسید سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد علامہ شبلی نعمانیؒ نے ندوۃ العلماء اور دارالمصنفین اعظم گڑھ کے نام سے الگ ادارے بنائے اور مسلمانانِ ہند کی فکری رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا۔ شبلی نعمانی چونکہ سرسید کے قریبی ساتھی رہے تھے اس لیے وہ سرسید احمد خاں اور ان کے نظریات کو دوسروں کی نسبت بہتر سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنی مختلف تحریروں میں سرسید احمد خاں کے مذہبی نظریات سے اختلاف کا اظہار کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ انگریزی زبان کی تعلیم کے مخالف نہ تھے اور نہ ہی جدید سائنسی تعلیم کے مخالف تھے لیکن اس بات پر سرسید کے سخت مخالف تھے کہ وہ عربی زبان کی تعلیم کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ عربی ہماری مذہبی زبان نہیں ہے، یہ صرف قرآن کی زبان ہے اور قرآن پڑھ لینا کافی ہے۔ علامہ شبلی نے سرسید کے ان تصورات و نظریات پر کڑی نکتہ چینی کی اور سرسید کے اس رویے کو سخت ناپسند کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''میری ہرگز یہ رائے نہیں کہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے ہٹا کر عربی کی طرف متوجہ کیا جائے۔ ایسا کرنا بے شبہ قوم کے ساتھ دشمنی ہے، لیکن اس بحث میں خواہ مخواہ علوم عربیہ کی تحقیر میں ارکانِ کالج کا اس قسم کے فقرے استعمال کرنا کہ ''ہم سے ہرگز یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ہم عربی تعلیم پر ایک حبہ بھی صرف کریں گے'' نہایت ظلم اور ناانصافی ہے اور اس سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کے دل میں کیا جذبات پوشیدہ ہیں۔ یہ کہنا کہ عربی زبان ہماری مذہبی زبان نہیں ہے، اور ہے تو صرف قرآن پڑھ لینا کافی

> ہے، ایک عامیانہ فریب دہی بلکہ بیہودہ ڈپلومیسی ہے۔ صاف کہنا چاہیے کہ ہم کو قرآن کی بھی ضرورت نہیں ـــــ عربی کی تحقیر نے ثابت کر دیا کہ قوم واقعی ذلت کے اخیر درجہ پر پہنچ گئی ہے کیونکہ کوئی قوم اس وقت تک ذلیل نہیں ہوتی جب تک وہ خود اپنے آپ کو ذلیل نہ سمجھے، اور یہ درجہ اب قوم نے حاصل کر لیا۔[۹]

مولوی مشتاق حسین، نواب وقار الملک بھی ان لوگوں میں شامل تھے جنھوں نے عمر بھر سرسید احمد خاں کے ساتھ تعلق برقرار رکھا۔ علی گڑھ کالج کے ساتھ ان کا تعلق بہت مضبوط تھا۔ علی گڑھ کالج کے انتظامی معاملات میں بھی ان کو دخل تھا۔ نواب وقار الملک نے زندگی بھر سرسید کا ساتھ دیا مگر نواب صاحب کو سرسید کے نظریات سے اختلاف رہا۔ ان نظریاتی اختلافات کا انھوں نے برملا اظہار بھی کیا۔ انھوں نے سرسید کے نام ایک خط میں **تہذیب الاخلاق** میں چھپنے والے ان مضامین پر بھی اعتراض کیا جن کے ذریعے سے سرسید کے مذہبی نظریات اور انگریزی حکومت کی تقلید اور فرماں برداری کے خیالات و نظریات کو عام کیا جا رہا تھا۔ انھوں نے ایک اور خط میں سرسید کو یہ بھی لکھا کہ جس بات کو آپ صرف اپنے لیے کام میں لانا چاہتے ہیں اس طرح آپ کو دوسروں کی رائے کا بھی احترام کرنا چاہیے اور دوسروں پر اپنی رائے ٹھونسنی نہیں چاہیے۔ انھوں نے مولانا حالی کے نام ایک خط میں سرسید کی کارپوریشن نواز پالیسی پر رفقائے کار کی گہری تشویش کا بھی اظہار کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے حالی کے نام خط میں اس بات کا تذکرہ بھی کیا کہ علی گڑھ کے بعض ٹرسٹیوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب ہم صرف قوم کی بہبود پر توجہ دیں گے اور سرسید کی مروت کو قومی بہبود کے مقابلے میں بالائے طاق رکھ دیں گے۔

نواب وقار الملک نے سرسید کے نام ایک خط میں سرسید کے مذہبی نظریات پر اعتراض کیا اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں سرسید کے بعض جملوں پر سخت اختلاف کیا اور یہ بات لکھی کہ میں ایسی ہستیوں پر تبرا سننے کو تیار نہیں ہوں۔ نواب وقار الملک نے سرسید کے نام ایک خط میں لکھا:

> ''ـــــ فقہ حنفیہ کی وہ کتابیں ''جن میں سراسر حیلہ ہی بھرا پڑا ہے'' میں نے نہیں پڑھیں، پس اس کا طعنہ فضول ہے۔ اور آج کل اس غریب فقہ کا

حُلیہ کس شمار میں ہے جہاں قانون میں ایسی ایسی باریکیاں موجود ہوں اور مفتیانِ زمانہ میں ایسے ایسے عالی دماغ موجود ہوں ـــــ اگر آپ کے خط میں امام ابوحنیفہؒ پر طعن وتشنیع نہ ہوتی اور آپ ان کو ضمناً حیلہ باز نہ کہتے تو میں اس جملے کے جواب ہی کو قلم انداز کر جاتا لیکن اس بات کی آپ مجھ سے توقع چھوڑ دیں کہ میں ان پیشوایانِ دین پر، جنھوں نے نہایت نیک نیتی سے آپ ہی کی مانند اپنی عمر اُمتِ اسلامیہ کی درستی احوال میں صرف کی ہو، تبرًا سننے پر راضی ہوں۔''[کے]

سید مہدی علی خاں نواب محسن الملک بھی سرسید کے رفقا میں شامل تھے۔ وہ بھی سرسید احمد خاں کے ساتھ علی گڑھ کالج کے انتظامی معاملات میں شامل رہے اور سرسید احمد خاں کے انتقال کے بعد انھوں نے ہی علی گڑھ کالج کو سنبھالا اور اس کی تعمیر وترقی کے لیے عمر بھر کوشاں رہے۔ نواب محسن الملک کا شمار جہاں سرسید کے انتہائی قریبی ساتھیوں میں ہوتا ہے وہاں وہ سرسید کے مذہبی نظریات کے سخت ترین ناقد تھے۔ ان کے سرسید کے نام لکھے ہوئے کئی خطوط موجود ہیں جن میں انھوں نے سرسید کے مذہبی نظریات پر سخت تنقید کی۔

نواب محسن الملک نے سرسید احمد خاں کے نام ایک خط میں لکھا کہ آپ نے یورپ کے ان لوگوں کے خیالات کو صحیح مان لیا جو پوری طرح سے مذہب کے پابند اور معتقد ہیں۔ آپ نے ان نظریات کی بنیاد پر قرآن حکیم کی آیات کی غلط تاویل وتفسیر کی۔ آپ نے مسلمان مفسروں کو تو خوب گالیاں دیں اور انھیں یہودیوں کا مقلد بتایا مگر آپ نے خود یورپ کے لامذہبوں کی مکمل تقلید کی اور آیات قرآنی کی غلط تاویلیں پیش کیں۔ اس حوالے سے وہ ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ آپ نے یورپ کے لامذہبوں کی تقلید میں بعض جگہ تو قرآن مجید کے وہ مطالب سمجھے جو آج تک کوئی دوسرا نہ سمجھ سکا۔ وہ سرسید کے نام خط میں لکھتے ہیں:

''میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ بعض جگہ تسامح کے درجہ سے گزر کر مغالطہ میں پڑ گئے اور جس حد پر پہنچ کر آپ کو ٹھہرنا چاہیے تھا، اُس سے گزر گئے۔ آپ نے اُن باتوں کو، جو اس زمانہ کے علم وسائنس نے پیدا کی ہیں، بغیر کسی شک وشبہ کے صحیح اور یقینی مان لیا اور جو باتیں قرآن میں بظاہر اس کی

مخالف معلوم ہوئیں اُس میں ایسی تاویلیں کرنی شروع کیں کہ قرآن کا مقصد ہی فوت ہو گیا، اور اس پر ستم ظریفی یہ ہے کہ آپ تاویل کو کفر قرار دیتے اور اپنی تفسیر کو قرآن کے الفاظ اور سیاق اور محاورے اور مقصود ومحاورے کے مطابق بتاتے ہیں ـــــــ بعض جگہ تو آپ قرآن کا وہ مطلب سمجھے جو نہ خدا سمجھا، نہ جبریل، نہ محمد ﷺ، نہ اصحابہؓ، نہ اہل بیتؓ، نہ عام مسلمان، اور کہیں نیچر کے دائرہ سے نکل گئے اور مذہبی آدمیوں کی طرح پُرانے خیالات اور پرانی دلیلوں اور پرانی باتوں کا گیت گانے لگے۔ چنانچہ آپ کی تفسیر میں دونوں باتوں کا جلوہ نظر آتا ہے۔ جہاں آپ نے دعا اور اجابت دعا کے مشہور معنوں سے انکار کیا، معجزات اور خرقِ عادات کو ناممکن سمجھ کر حضرت عیسیٰؑ کے بے باپ پیدا ہونے اور اُن کی طفلی کے زمانہ کے واقعات اور احیائے اموات وغیرہ باتوں کو اہل کتاب کی کہانیاں بتلایا وہاں آپ نے دکھا دیا کہ آپ کی تفسیر قرآن کے الفاظ اور سیاق عبارت اور اس کے عام منشا سے کچھ مناسبت اور مطابقت نہیں رکھتی''۔[۸]

شمس العلماء خان بہادر مولوی نذیر احمد کا شمار بھی سرسید کے خاص رفیقوں میں ہوتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد اردو کے معروف ادیبوں میں شامل ہیں۔ انھوں نے خواتین کے لیے اصلاحی ناول لکھ کر شہرت حاصل کی۔ اس کے علاوہ ان کی دوسری کتب بھی اہم ہیں۔

مولوی نذیر احمد بھی سرسید کی طرح مسلم امہ کے خیر خواہ تھے اور مسلمانان ہند کی خیر خواہی چاہتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ مسلمانِ ہند جدید تعلیم حاصل کریں۔ اس سلسلے میں انھوں نے سرسید کا بھرپور ساتھ دیا اور علی گڑھ کالج کی تعمیر و ترقی میں بمقدور حصہ لیا۔ انھوں نے علی گڑھ میں طلبا کے رہنے کے لیے بورڈنگ ہاؤس بنوایا اور پانی کے حصول کے لیے جو کنویں کھودے گئے ان میں بھی چندہ دیا۔ انھوں نے اس کے علاوہ بھی مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی دل کھول کر مدد کی کیونکہ وہ اس ادارہ کو مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ضروری سمجھتے تھے لیکن انھوں نے کبھی سرسید احمد خاں کی کتب، رسائل یا کسی اور تحریر کو نہیں خریدا کیونکہ وہ سرسید کے نظریات سے متفق نہیں تھے بلکہ ان کے نقاد تھے۔

انھوں نے سرسید کے ان نظریات پر سخت نکتہ چینی کی جن میں سرسید نے فرشتوں کے وجود، جنت، دوزخ کے تصور اور اخروی زندگی میں جزاوسزا کے تصورات کے حوالے سے عجیب وغریب نظریات پیش کیے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے سرسید احمد خاں کی لکھی ہوئی تفسیر قرآن پر بھی سخت اعتراضات کیے اور سرسید احمد خاں کے نظریات کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ وہ کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) قرآن کا اللہ کی طرف سے نازل ہونے کا انکار آسان ہے اور سرسید کے پیش کردہ معنی و مفہوم پر یقین کرنا مشکل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''سرسید احمد خاں کی تفسیر ایک دوست کے پاس دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میرے نزدیک وہ تفسیر دیوانِ حافظ کی اُن شروح سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جن کے مصنفین نے جوتڑوں سے کان گانٹھ کر سارے دیوان کو کتاب تصوف بنانا چاہا۔ جو معانی سید احمد خاں صاحب نے منطوق آیاتِ قرآنی سے اپنے پندار میں استنباط کیے (اور میرے نزدیک زبردستی مڑھے اور چپکائے)، قرآن کے منزل من اللہ ہونے سے انکار کرنا سہل ہے اور ان معانی کو ماننا مشکل ــــ یہ وہ معانی ہیں جن کی طرف نہ خدا کا ذہن منتقل ہوا، نہ جبریل حاملِ وحی کا، نہ رسولِ خدا کا، نہ قرآن کے کاتب و مدون کا، نہ اصحاب کا، نہ تابعین کا اور نہ جمہور مسلمین کا۔''[۹]

سید امداد العلی کا شمار برصغیر کے نامور اہل قلم میں ہوتا ہے۔ انھوں نے بھی سرسید کی پالیسیوں اور ان کے نظریات سے سخت اختلاف کیا اور اپنے نقطہ نظر کو بیان کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ سرسید احمد خاں نے مدرستہ العلوم کی تجویز کے مخالفوں کو خبیث النفس، بد باطن، خود غرض، حاسد اور ترقی پر خفا ہونے والے متعصب وہابی وغیرہ قرار دیا۔ کسی کو بدتمیز اور نادان قرار دیا۔

سید امداد العلی کے مطابق کچھ عجب نہیں کہ انھیں ایک مرض پیدا ہو گیا ہو جس کی صفت تفسیر ظنون وافکار ہے۔ اس مرض میں مبتلا مریض ہمیشہ دوسروں سے بدگمان رہتا ہے اور دوسروں کو حاسد اور دشمن سمجھتا ہے۔ سرسید احمد خاں کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ وہ ہر وقت دوسروں سے بدگمانی کا شکار رہتے ہیں۔

سید امداد العلی نے ایک اور حوالے سے بھی سرسید احمد خاں کی ذات پر اعتراض کیا ہے

کہ وہ خود اور ان کے کئی ساتھی جو مدرستہ العلوم کے تجویز کرنے والے ہیں نہ تو علوم قدیمہ سے واقف ہیں اور نہ ہی جدید علوم کے ماہر ہیں۔ انھوں نے اہلِ علم کے سامنے زانوئے تلمذ بھی تہ نہیں کیا لہٰذا ایسے لوگ کسی علم یا کتاب کے مفید یا غیر مفید ہونے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور نہ ہی وہ یہ جانتے ہیں کہ کسی طریقہ تعلیم کی خوبیاں اور خامیاں کیا ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ مدرسہ مسلمانوں کی بہتری کے لیے نہیں بنایا جا رہا بلکہ مسلمانوں کو سیدھی راہ سے بھٹکانے اور قوم کو جہالت میں ڈالنے اور دنیاوی و اخروی فوائد سے محروم کرنے کے لیے بنایا جا رہا ہے۔ سید امداد العلی لکھتے ہیں:

> مدرستہ العلوم کا تجویز کرنا آیا قوم کی بھلائی اور بہتری اور علم کی روشنی پھیلانے اور روشن ضمیر بنانے اور اعلیٰ درجے کی لیاقت اور تہذیب اور شائستگی بخشنے کے لیے ہے یا واسطے نام آوری اور فخر اور خواہش ہم سری گورنمنٹ اور قضائے ہوائے نفس اور مسلمانوں کو سیدھی راہ بھلانے اور قوم کو جہالت میں ڈالنے اور دنیوی اور اخروی منافع سے محروم رکھنے کے لیے ہے؟"[۱۰]

اس حوالے سے صفدر سلیمی کے خیالات ملاحظہ ہوں:

> "اگر سرسید کا یہ شاہکار (مدرستہ العلوم) سامنے نہ آتا تو اس ملک کی فضاؤں میں نہ محمد علی جوہر اور ظفر علی خاں کے نعرہ ہائے حُریت سنائی دیتے، نہ اقبال کے حیات آفریں نغموں کی گونج فردوسِ گوش بنتی اور نہ وہ قائداعظمؒ میدانِ قیادت میں نظر آتا جس کا تدبّر برطانوی سامراج اور ہندو سامراج کے لیے ملک الموت ثابت ہوا اور مسلمانوں کے لیے ایک عظیم مملکت کا نقطۂ آغاز۔"[۱۱]

عبدالحق حقانی کا شمار بھی ممتاز علما اور اہلِ علم میں ہوتا ہے۔ انھوں نے بھی تفسیر قرآن میں بیان کردہ سرسید احمد خاں کے خیالات و نظریات پر ان کی کڑی گرفت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سترھویں صدی میں فرانس اور جرمنی میں بہت سے ایسے لوگ سامنے آئے جو صرف خدا کے قائل تھے۔ انبیا ان کے معجزات، امورِ آخرت، جن و ملائکہ اور وجودِ آسمانی کو بھی قصہ کہانی گردانتے تھے۔

اِن خیالات کے حامل لوگ چونکہ صاحب تصنیف بھی تھے اس لیے ان کے خیالات نے یورپ میں خوب مقبولیت حاصل کی اور بعدازاں اس کے اثرات امریکہ اور دوسرے ملکوں تک بھی پہنچے۔

انگریزی حکومت کے ساتھ ہی یہ اثرات ہندوستان میں بھی آئے۔ یہاں بھی لوگ ان نظریات سے متاثر ہوئے ایسے ہی لوگوں میں سرسید احمد خاں بھی تھے جنھوں نے مذہب اسلام کو برائے نام رکھ کر ایک جدید مذہب کی بنیاد انھی ملحدانہ اصولوں پر رکھی جو یورپ سے آئے تھے۔ سرسید احمد خاں نے اپنے اِن ملحدانہ خیالات کو تفسیر قرآن مجید کے پیرائے میں بیان کیا۔ اپنی کتاب ''تفسیر حقانی'' کے مقدمے میں عبدالحق حقانی لکھتے ہیں:

''سترھویں صدی میں فرانس اور جرمنی میں سینکڑوں ایسے لوگ صاحب تصنیف ظاہر ہوئے کہ جو صرف خدا کے قائل تھے، باقی انبیا اور ان کے معجزات اور امور آخرت اور جن و ملائکہ بلکہ وجود آسمان سب کو قصہ کہانی جانتے تھے اور پھر انگلستان میں بھی اس کا چرچا پھیلا ـــــ اور پھر تو امریکہ، ہسپانیہ وغیرہ جمیع بلادِ یورپ میں بھی یہ بلا پھیل گئی اور اُن نام کے عیسائیوں کی یہ بلا ہندستان میں بھی آئی اور کلکتہ میں رام موہن نامی بنگالی نے ۱۸۴۰ میں انھی اصولوں پر بت پرستی سے ناراض ہو کر ایک جدید مذہب کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام برہمو سماج رکھا۔ پھر اس کے شاگردوں نے انگریزی خواں بنگالیوں میں اس کو بہت رواج دیا اور ان کی تقلید سے ایک شخص دہلی کے رہنے والے سید احمد خاں نے بھی مذہب اسلام کو برائے نام قائم رکھ کر ایک جدید مذہب کی انھی اصول ملحدانہ پر بنیاد ڈالی اور قرآن مجید کو تفسیر کے پیرائے میں اپنے خیالات ملحدانہ کے تابع بنایا۔''[۱۲]

عبدالحق حقانی لکھتے ہیں کہ سرسید احمد خاں نہ تو علوم قدیمہ سے واقف ہیں اور نہ علوم جدیدہ پر دسترس رکھتے ہیں۔ وہ علمی کمزوری کی وجہ سے جدید فلسفہ سے متاثر ہوئے اور ملحدانِ یورپ کے راستے پر چل پڑے اور اسلام کو عقل کے مطابق بنانے کے لیے تاویلیں کرنے لگے حالانکہ جدید فلسفے کے اسلام پر کوئی قوی اعتراض ہی نہیں۔ وہ اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

''سید صاحب نہ علوم قدیم سے واقف، نہ نئے علوم اور جدید فلسفہ سے

بہرہ رکھتے ہیں، اپنی علمی کمزوری سے فلسفہ جدید سے اسلام کا شکست کھانا
تسلیم کر بیٹھے اور اصول اسلام کی تاویلیں کرنے لگے حالانکہ اسلامی اصول
پر فلسفہ جدید کا کوئی قوی اعتراض ہی نہیں پڑتا۔"[۱۳]

سر سید کے خیالات اور نظریات کے بارے میں عبدالحق حقانی کی رائے دیکھنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ حقانی صاحب کے نزدیک سر سید قدیم اور جدید علوم سے واقف نہ تھے اس حوالے سے احمد ندیم قاسمی کی رائے یکسر مختلف ہے احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

"اگر سر سید انیسویں صدی کے نصف آخر میں اپنی اصلاحی تحریک نہ
چلاتے تو نہ صرف یہ کہ ان حضرات کا جدید تعلیم سے مسلح ہونا مشکوک تھا
بلکہ ہم سب لوگوں کا، جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، غیرت مندانہ
وجود تک مشکوک تھا۔"[۱۴]

علی بخش خاں بھی سر سید کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے بھی اپنی تحریروں میں سر سید احمد خاں کے نظریات پر سخت نکتہ چینی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ بات درست ہے کہ ہماری قوم کو جدید علوم کی ضرورت ہے کیونکہ اب علوم قدیمہ اور کتب معقولات سے کام نہیں چلتا۔ لہٰذا یہ امر ضروری ہے کہ مسلمانانِ ہند کو جدید علوم پڑھائے جائیں، بیشک وہ انگریزی سے ترجمہ کر کے ہی پڑھائے جائیں۔ لیکن جدید علوم کی تعلیم دیتے وقت اس بات کو مدنظر رکھا جائے کہ قرآن وحدیث اور تفسیر وفقہ کی تعلیم میں کسی طرح کا خلل واقع نہ ہو۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ مجھے اس بات پر سخت افسوس ہے کہ سر سید احمد خاں جیسا شخص جسے اللہ تعالیٰ نے ناموری، عزت وتوقیر دی اور عقل وشعور بھی بخشا اور انھوں نے قومی ترقی کا ارادہ بھی ظاہر کیا وہ مسلمانوں کو جدید علوم سکھانے کی بجائے مذہبی نظریات کے ساتھ دست اندازی کرنے لگے اور مذہبی نظریات کو درست کرنے کا جنون اس حد تک بڑھا کہ انھیں اس کے سوا اور کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ قوم کو ان سے نفرت ہوگئی اور میں بھی ان کا جس قدر مخالف ہوں اس کی وجہ ان کے مذہبی نظریات ہیں نہ کہ ان کی ذات یا علوم جدیدہ۔

وہ مزید لکھتے ہیں کہ میں صرف اور صرف اس لیے مدرستہ العلوم کے کاموں میں شریک نہ ہوا کہ میں اس کے طالب علموں کی مذہبی تعلیم کی طرف سے کبھی مطمئن نہیں رہا۔ مجھے ہمیشہ اس بات کا خوف رہا کہ جیسے عقائد سر سید احمد خاں کے ہیں ویسے ہی عقائد اس مدرسہ کے طلبہ کے بھی

ہوں گے۔ سرسید احمد خاں چونکہ دینی علوم قرآن وحدیث، فقہ وتفسیر سے پوری طرح شناسانہ تھے اور نہ ہی وہ جدید علوم کے ماہر تھے اس لیے انھوں نے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے میں جا بجا ٹھوکریں کھائیں اور تفسیر قرآن میں آیاتِ قرآنی کی ایسی تاویلیں کر گئے جو آج تک کسی اور نے نہ کی تھیں۔ اس حوالے سے علی بخش خاں لکھتے ہیں:

''جو تفسیر کہ اب حضورِ والا نے ایجاد کی ہے ـــــــ رسولؐ، بعدہٗ صحابہ وتابعین، بعدہٗ ائمہ، مفسرین، محدثین ـــــــ کسی ایک نے بھی آپ کے موافق تفسیر آیات قرآنی کی نہ بنائی، نہ کچھ ایسا دقیق مضمون تھا کہ حضور والا کے سوا، بارہ سو برس تک کسی کو نہ سوجھا، سب کے سب غلط تفسیر کرتے رہے اور رسولؐ چیستان اور معمے ہی بولتے رہے ـــــــ رسولؐ جو نہایت عمدہ حقائق ومعارف بتاتے تھے، کیا سخت مشکل میں پڑ جاتے! افسوس ہے کہ موسیٰ کے زمانہ سے آج تک آپ ہی ایک حکیم اور فلسفی ایسے پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے صحیح معنے کلام الٰہی کے سمجھ پائے ہیں تو خدا جانے پھر قرآن شریف کیونکر معجزہ رہے گا! شاید قرآن آپ کے نزدیک کسی معما کا نام ہے جو ہزاروں برس بعد کسی کو الہام کے ذریعے حل ہو جاتا ہے''۔[۱۵]

محمد قاسم نانوتوی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ نے انگریزی حکومت کے زمانے میں بڑی ہمت اور پامردی سے قدیم اسلامی علوم کے چراغ روشن کیے اور دارالعلوم دیوبند آج بھی ان کی صدقِ دل سے کی جانے والی محنت کی داستان سنا رہا ہے۔ وہ معروف عالم دین تھے اور ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب دین کی کم فہمی اور دین سے دوری ہے۔ اگر مسلمانوں کے اندر دینی شعور پوری طرح سے اجاگر ہو جائے اور وہ دین اسلام کو اپنے عمل کا جزو لازم بنالیں تو آج بھی مسلمان اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ انھوں نے انھی نظریات کی بنیاد پر مسلمانوں کے لیے مذہبی تعلیم کے ادارے کا بندوبست کیا اور مسلم نوجوانوں کو مذہبی تعلیم دی۔ وہ بھی سرسید احمد خاں کے مذہبی نظریات سے متفق نہ تھے بلکہ سخت نالاں تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ سرسید احمد خاں اپنے باطل نظریات کو چھوڑ کر دوبارہ حقیقی دینی نظریات کو اپنائیں مگر سرسید اس کے لیے تیار نہ تھے۔ محمد قاسم نانوتوی لکھتے ہیں:

''سید صاحب کی ہاں سے ہاں ملانا ہم سے جب ہی متصور ہے کہ سید صاحب اپنے ان اقوال مشہورہ سے رجوع کریں جواُن کی نسبت ہر کوئی گا تا پھرتا ہے اور سید صاحب ان پر اصرار کیے جاتے ہیں اور رجوع نہیں فرماتے ـــــ اس میں کچھ شک نہیں کہ میں سید صاحب کی اولوالعزمی اور دردمندی اہل اسلام کا معتقد ہوں اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہار محبت کروں تو بجا ہے، مگر اتنا یا اس سے زیادہ ان کے فساد عقائد کو سن سن کر اُن کا شاکی اور ان کی طرف سے رنجیدہ خاطر ہوں ـــــ کوئی کچھ کہے وہ اپنی وہی کہے جائیں گے۔اُن کے اندازِ تحریر سے یہ بات نمایاں ہے کہ وہ اپنے خیالات کو ایسا سمجھتے ہیں کہ کبھی غلط نہ کہیں گے۔''[۱۶]

میر ناصر علی دہلوی بھی سر سید کے ہم عصر تھے۔انھوں نے بھی اپنی تحریروں میں سر سید احمد خاں کے باطل نظریات سے اختلاف کا اظہار کیا۔وہ لکھتے ہیں کہ بعض نیچریوں نے ایک قسم کا دہریہ پن مع خدا کے نکالا مگر اہلِ ایمان نے کبھی بھی ان پر اعتبار نہیں کیا۔نیچری بھی اپنے نظریات کو کسی مذہب سے نہ ملا سکے۔سر سید احمد خاں جب ولایت گئے تو وہاں انھوں نے نیچریت کا چرچا دیکھا۔یورپ میں نیچریت کے علمبردار تو ہر مذہب کو نیچر کے خلاف بتاتے ہیں۔سر سید احمد خاں بھی نیچریوں سے متاثر ہوئے اور سوچا کہ اس کو اسلام سے خلط ملط کر دیا جائے۔یہ ایسا کام ہوگا کہ جو آج تک یورپ کے نیچری بھی نہیں کر سکے۔سر سید احمد خاں کی اس بات کو ہندوستان کے بعض لوگوں نے نئی بات سمجھ کر قبول کیا اور یورپ والے چونکہ اسلام کی اصل روح سے ناواقف تھے لہٰذا وہ بھی قائل ہو گئے۔سر سید کو چونکہ انگریزی پر عبور نہ تھا اس لیے وہ نیچریوں کے عقائد و نظریات سے بھی پوری طرح آگاہ نہ ہو سکے لہٰذا چند سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر مذہب کے بنیادی عقائد کے خلاف اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرنے لگے۔

سر سید احمد خاں نیچری ہونے کا دعویٰ تو کرتے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ خود بھی نہ جانتے تھے کہ نیچر اور نیچریت کیا ہے اور ان کے بنیادی عقائد کیا ہیں۔لہٰذا اپنی کم علمی بلکہ لاعلمی کی بنا پر اپنے نظریات باطلہ کا پرچار کرنے لگے اور جرأت دکھانے لگے۔نیچری عقائد اور اسلام کو خلط ملط کرنے سے سر سید کا مقصد شاید یہ تھا کہ اس طرح یورپ کے نیچری اسلام کی خوبیوں کے قائل ہو جائیں گے مگر یہ نہ ہو سکا البتہ سر سید احمد خاں کے نظریات سے مسلمانوں پر برا اثر ضرور پڑا۔اس حوالے سے میر ناصر علی دہلوی نے لکھا ہے:

''تحقیقات نیچریہ میں اسلام پر ایمان کہاں؟ یہ سید احمد خانی ایجاد ہے کہ دونوں سے لڑے۔ نہ نیچر کو مانے اور نہ عقائد اسلام کو سچا جانے، وہ نیچری مسلمان بنے۔ بڑی رعایت کر کے اگر یہ کہا جائے کہ تحقیقات نیچر کو اسلام میں لانے سے سید احمد خاں صاحب کی شاید یہ غرض ہے کہ یورپ کے نیچری اسلام کی خوبیوں کے قائل ہوں۔ بات تو ظاہر میں بہت پھبتی ہے مگر ایک انگریز سے جو ذکر آیا تو بہت ہنسا اور کیا معقول جواب دیا کہ ''وہ کیا مانیں گے مگر اس انتظار اور اس سامان میں مسلمان تو ضرور نیچری ہو جائیں گے''۔ اور یہی ہو رہا ہے کہ نیچری تو کوئی مسلمان نہیں ہوتا مگر مسلمان بگڑے جاتے ہیں۔''[۱۷]

مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے پوری اردو دنیا واقف ہے۔ مولانا آزاد نامور عالم دین، صحافی، مقرر، سیاستدان اور خطوط نگار تھے۔ ان کی نثر اپنی مثال آپ ہے۔ مولانا آزاد اپنی عمر کے ابتدائی حصے میں سرسید احمد خاں کی تحریروں سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سرسید کی تحریروں کو پڑھ کر ایک نئی دنیا نظروں کے سامنے آ گئی اور جوں جوں پڑھتا جاتا تھا تحریر کی دلفریبی بڑھتی جاتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ میری دماغی فعالیت عامل کے قبضے میں ہے۔ دماغ کی حالت مخمور رہنے لگی۔ یوں لگتا تھا کہ عقائد و نظریات کا ایک عجیب و غریب خزانہ ہاتھ آ گیا ہے اور اس زمانے میں اس پر فخر و غرور تھا اور اس کے سامنے فکر و عقائد اور نظریات کی تمام پچھلی باتیں ہیچ نظر آتی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کی اصل حقیقت وہ ہے جو سرسید نے بتائی ہے اور قرآن کے اصل معانی و مفاہیم وہ ہیں جو سرسید نے بتائے ہیں۔ اسی حوالے سے مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

''سرسید کی تصنیفات جب نظر سے گزریں تو بالکل ایک نئی دنیا نظر کے سامنے آ گئی۔ طبیعت چونکہ موجودہ وسابقہ حالات سے بالکل متوحش ہو چکی تھی اور ماحول میں کوئی غالب موثر موجود نہ تھا اس لیے قدرتی طور پر اس نئے عالم کی دلفریبیوں نے مسحور کر لیا۔ جوں جوں بڑھتا گیا، مسحوریت بھی بڑھتی گئی حتی کہ اب ایک مسمریزم کے معمول کی طرح میری دماغی فعالیت بالکل عامل کے قبضہ میں تھی۔ تقریباً چھ مہینے کے اندر میں نے

سرسید کی تمام کتابیں دیکھ ڈالیں اور اچانک ایسا معلوم ہوا کہ ایک بے حد عجیب و مدہش اور بلند تر پرعظمت عالم میں آ گئے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بالکل اک مخمور دماغ کی سی حالت رہنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک عجیب وغریب خزانہ قبضے میں آ گیا ہے۔ اس پر فخر تھا، غرور تھا اور اس کے سامنے فکر وعقائد کی تمام پچھلی باتیں، ہیچ نظر آتی تھیں۔ میں نے ''ہیچ'' کہا لیکن یہ ابتدائی احساس تھا۔ بعد کو یوں ہوا کہ حقارت کی جگہ ان کی ذلت کا احساس ہونے لگا ـــــ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بھی اسلام کی اصلی حقیقت یا سرسید کی اصطلاح میں ''ٹھیٹ'' اسلام سے آشنا نہیں، قرآن کے اصلی حقائق ومعارف اور مذہب کی اصلی تعلیمات تو وہ ہیں جن کے چہرے پر سے تیرہ سو برس بعد اس مجدد اعظم (جیسا کہ میری اُس وقت کی بول چال تھی، یعنی سرسید) نے پردہ ہٹایا ہے ـــــ ''[۱۸]

مولانا آزاد کہتے ہیں کہ سال بھر یہ کیفیت اپنے عروج پر رہی لیکن اس کے بعد وہ منزل سامنے نظر آنے لگی جو اس کے بعد قدرتی طور پر پیش آنے والی تھی یعنی الحاد۔ جب یہ حالت ہوئی تو سرسید کے مسلک کی جدت وغرابت کا اثر دھیما پڑنے لگا اور طبیعت آہستہ آہستہ اپنے اصل پر آنے لگی۔ اب یہ محسوس ہونے لگا کہ سرسید نے مذہب کے عقائد ونظریات کو شکوک وشبہات کی نظر سے دیکھا تھا لیکن اب سرسید کے نظریات بھی وہم وخیال نظر آنے لگے۔ اس کے بعد سرسید کے نظریات سے طبیعت اچاٹ ہوگئی۔ جو دروازہ سرسید کے نظریات نے کھولا تھا اس نے بالآخر شکوک وشبہات کی ایک نئی راہ میں پہنچا کر الحاد وانکار تک پہنچا دیا۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں:

''سرسید کے مذہبی مسلک سے طبیعت اچاٹ ہوگئی اور جو دروازہ انھوں نے کھول دیا تھا۔ اس نے بالآخر شک واضطراب کی ایک نئی راہ میں پہنچا کر الحاد وانکار تک پہنچا دیا۔ ابتدا میں پھر مذہبی تاویلات کا استغراق اور ایک فلسفیانہ مذہب کا ادعا، پھر مزید اضطراب وجستجو اور اس سے الحاد و انکار کا ظہور اور بالآخر ایک سخت اضطراب ویاس کا جماؤ۔''[۱۹]

مولانا آزاد یہ بھی لکھتے ہیں کہ نئے علوم کے خلاف شکوک وشبہات بھی خود سرسید احمد

خاں اور ان کے ہم خیال لوگوں نے پیدا کیے۔ انھوں نے محض سنی سنائی باتوں سے اپنے جی میں شکوک وشبہات پیدا کیے اور پھر خود ہی شور مچانا شروع کر دیا کہ نئے علوم نے اسلام کا خاتمہ کر دیا حالانکہ اس زمانے میں ایسے لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی جو جدید علوم سے واقف تھے۔

پروفیسر اصغر عباس کا شمار ان اہل قلم میں ہوتا ہے جنھوں نے عہد سرسید کے بعد سرسید کے افکار ونظریات کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ وہ لوگ جنھوں نے سرسید احمد خاں سے بالواسطہ طور پر استفادہ کیا اور کسب فیض کیا ان سے سرسید کی روح سوال کرتی ہے کہ قومی تعمیر کے لیے سرسید کے جو منصوبے تھے ان کے نفاذ کے لیے ان لوگوں نے کیا کیا؟ وہ لوگ سرسید کی برسی تو بڑے زور وشور سے مناتے ہیں۔ اس سلسلے میں جلسے، جلوس ہوتے ہیں، لمبی چوڑی تقریریں ہوتی ہیں اور وہ باتیں سرسید سے منسوب کر دی جاتی ہیں جو سرسید کے تقریر وتحریر میں کہیں دکھائی نہیں دیتیں۔ ایسے مواقع پر سرسید کے نظریات کی خوب کتر بیونت ہوتی ہے۔ سرسید کے نام پر کیک کاٹے جاتے ہیں، ڈنر کھائے جاتے ہیں کیا یہی سرسید جیسی شخصیت کی یاد منانے کا طریقہ ہے؟ سرسید کی عظمت کا راز ان کے افکار واعمال اور خیالات ونظریات کے علاوہ ان کی دانا ذات میں پوشیدہ ہے۔ سرسید وہ شخص تھا جس نے انتہائی پرآشوب اور ناگفتہ بہ حالات میں قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور قوم کی فکری رہنمائی کی۔ اس کے ساتھ ساتھ قوم کے فرسودہ عقائد اور باطل نظریات کی اصلاح کرنے کی بھی کوشش کی۔ انھوں نے مذہب اور عقل کے بعد کو مٹانے کی سعی کی۔ انھوں نے مذہبی رواداری کو فروغ دینے کی بھی کوشش کی وہ انسانی ہمدردی کا ایک اعلیٰ نمونہ تھے۔ ان کی تحریروں میں اہل ہند کے لیے بے پناہ پیار ملتا ہے۔

پروفیسر اصغر عباس اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''میں سوچتا ہوں کہ کیا یہی ظاہری نمود ونمائش سرسید جیسی قائم و دائم شخصیت کے خواب اور اس کے سوال کا جواب ہے؟ سرسید کی دلکشی کا راز ان کے افکار واعمال کے علاہ بہت کچھ ان کی قوی اور دانا ذات میں مضمر ہے۔ انھوں نے انتہائی پُرآشوب دور میں رہنمائی کا اور اصلاح کا مشکل کام انجام دیا تھا، فرسودہ خیالات اور باطل عقائد کی اصلاح کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے مذہب اور کٹر پن کے فرق کو بتایا تھا اور مذہب اور عقل کی

دوئی کو مٹایا تھا۔ مذہب کے روایتی اور رسمی عناصر کو دور کرنے اور انسان دوستی اور رواداری کو فروغ دینے کی نہ صرف کوشش کی تھی بلکہ اپنے اداروں میں اسے عملی جامہ پہنایا تھا۔ ــــــ ان کا ذہن وسعت نظر کا اور ان کا قلب انسانی دردمندی کا بے مثال نمونہ تھا۔ ان کی تحریروں میں ہندوستان کے باسیوں ہندوؤں اور مسلمانوں سے بے پناہ پیار اور اپنے دیس سے والہانہ محبت ملتی ہے۔''[۲۰]

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری کا شمار پاکستان کے ممتاز اہلِ قلم میں ہوتا ہے۔ انھوں نے سرسید کے مذہبی نظریات کو اپنی تحریروں میں کڑی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ موجودہ صدی کی بے دینی مذہبی بے راہ روی، بدعقیدگی اور مذہبی بیزاری کی اصل جڑ سرسید احمد خاں کے نظریات تھے۔ سرسید احمد خاں کے دو دشمن تھے، ایک انگریز کے دشمن اور برصغیر کی آزادی کے خواہشمند اور دوسرے علمائے دین۔ دراصل علمائے دین ہی انگریزی حکومت کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ سرسید نے اپنی تحریروں میں علمائے دین کے خلاف خوب لکھا اور ان کی تضحیک کی۔ انھوں نے علمائے دین کو کبھی معاف نہیں کیا۔ انھوں نے تفسیر قرآن میں، دینی مضامین میں، ادب کے مباحث میں اور اپنی دوسری ہر قسم کی تحریروں میں انگریز حکومت کے دشمن علمائے کرام کو خوب تنقید کا نشانہ بنایا کیونکہ اپنوں سے بیزاری اور انگریزی حکومت سے یاری سرسید کا مذہب تھا۔ کوئی بھی شخص انگریزوں کی مخالفت کر کے سرسید کے عتاب سے بچ نہیں سکتا تھا۔ اسی طرح مذہبی حوالے سے بھی علمائے دین کی تضحیک کو سرسید نے اپنے اوپر فرض کر لیا تھا۔ دین سے وابستگی رکھنے والے اور دینی نظریات کا پرچار کرنے والے سرسید کے نزدیک بہت غلط الفاظ ملتے ہیں۔ اسی طرح عبادت گزار علما کے لیے انھوں گھٹیا الفاظ استعمال کیے۔ غرض سرسید احمد خاں نے ہر حوالے سے علمائے حق کی مخالفت کی اور انگریز دوستی کا حق ادا کیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری لکھتے ہیں:

''سرسید نے دونوں حیثیتوں سے علمائے دین کو کبھی معاف نہیں کیا۔ تفسیر کے دینی مباحث میں، ادب کے سنجیدہ مضامین میں، تمثیلوں اور تجزیوں میں انھوں نے انگریز کے ان دشمنوں کو اپنی مخالفت، طنز و تعریض اور تضحیک

وتمسخر کا نشانہ بنایا۔ انگریز سے دوستی اور اس کے مخالفوں کی دشمنی سرسید کا مذہب تھا۔ کوئی شخص انگریز سے دشمنی کر کے سرسید کا دوست نہیں بن سکتا تھا، گویا یہ دو تلواریں تھیں جو سرسید کے میان قلب میں جگہ نہ پا سکیں۔ اسی طرح مذہبی حیثیت میں انگریز کے ان دشمنوں کی مخالفت اور طنز و تعریض ان کا دین بن گیا تھا۔[۲۱]

ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں کہ وہ لوگ جو سرسید کو بانیانِ آزادی میں شمار کرتے ہیں انھیں سرسید کے ان بیانات کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے جن میں انھوں نے آزادی کے اصل بانیان اور سرفروشانِ قوم و وطن کو برا بھلا کہا۔ سرسید نے سلطان ٹیپو، سراج الدولہ، بہادر شاہ ظفر اور آزادی کے لیے لڑنے والوں کے لیے جو الفاظ استعمال کیے وہ قابلِ گرفت بھی ہیں اور قابلِ مذمت بھی۔ انھوں نے آزادی کے طلبگاروں کی تضحیک کی اور غدارانِ ملک و ملت جعفر و صادق وغیرہ کی عقل و فراست اور سیرت و کردار کی تعریف کی اور انھیں ملک و قوم کا ہی خیر خواہ قرار دیا۔ جنگ آزادی کے مجاہدین کے خلاف انھوں نے جو گھٹیا زبان استعمال کی اسے سن کر ہی شرم سے نگاہیں نیچی ہو جاتی ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریر و تقریر کی تمام صلاحیتوں کو انگریزی حکومت کے دوام کے لیے صرف کیا۔ انھوں نے علی گڑھ کے طلبا کے اندر بھی جذبہ حریت کو دبایا اور انھیں انگریزی حکومت کے وفادار رہنے کی ہمیشہ تلقین کی۔ کیا سرسید کے ان خیالات و نظریات کے بعد بھی انھیں بانیان آزادی میں شمار کیا جا سکتا ہے؟ اس حوالے سے ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری لکھتے ہیں:

> ''جو لوگ سرسید کو بانیان آزادی میں شمار کرتے ہیں، انھیں سرسید کے ان بیانات و ملفوظات پر غور کرنا چاہیے اور اس پہلو پر بھی نظر ڈال لینی چاہیے کہ حقیقی بانیان آزادی اور سرفروشان قوم اور جاں نثاران وطن سلطان ٹیپو، سراج الدولہ، بہادر شاہ ظفر وغیرہ کے بارے میں ان کے خیالات کیا تھے؟ اور اس کے برعکس غدارانِ وطن جعفر و صادق وغیرہ کی سیرت اور عقل و فراست اور ان کی ملی بہی خواہی کو انھوں نے جو خراج تحسین پیش کیا ہے، کس سے چھپا ہوا ہے؟ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے مجاہدین کو وہ کون سی گالی ہے جسے سن کر دلی کے شرفا نگاہیں نیچی نہ کر لیں اور سرسید نے تحریر نہ

کر دی ہوں؟ انگریزوں کی حکومت کو استحکام بخشنے کے لیے انھوں نے تحریر و تقریر کی کس صلاحیت کو نہیں آزمایا؟ ''لائل محمڈنز'' ان کے نزدیک ملک و قوم کی علمی، تعلیمی، سماجی خدمات انجام دینے والے تھے یا ۱۸۵۷ء میں اور بعد میں ملک و قوم کے جذبات کے خلاف انگریزوں کی حکومت کی جڑیں مضبوط کرنے والے ملک و قوم کے غدار تھے؟ ۱۸۹۸ء میں اپنی وفات تک علی گڑھ کالج کے طلبہ میں حریت پسندی کے جذبہ کو دبا دینے کی کوشش میں انھوں نے کون سی کسر اٹھا رکھی تھی؟ ــــــ ان عظیم الشان خدمات اور بلند خیالات کے بعد بھی سرسید کو بانیانِ آزادی میں شمار اور آزادی کی تاریخ میں سب سے اونچا مقام دیا جا سکتا ہے؟''[۲۲]

اصغر علی روحی نے بھی سرسید کے خیالات و نظریات کو بنظر استحسان نہیں دیکھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت کو انگریزی رنگ میں رنگنا چاہا اور مسلمانوں کے مذہبی نظریات کی بھی ایک نئی بنیاد رکھنا چاہی مگر وہ دونوں حوالوں سے کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ خود جدید علوم سے بے بہرہ تھے۔ ان کے پاس جو کچھ علم تھا وہ محض سنی سنائی باتیں تھیں۔ سرسید احمد خاں نے دینی عقائد و نظریات پر پانی پھیر کر رکھ دیا اور خم ٹھونک کر علمائے حق کے سامنے آ کھڑے ہوئے اور نئے نظریات کا پرچار کرنے لگے اور اصل عقائد و نظریات سے انکار کرنے لگے حالانکہ محض انکار تو کوئی کمال نہیں۔ بات تو تب بنتی کہ وہ اصل دینی نظریات کو جدید علوم کے اصولوں پر پایہ ثبوت کو پہنچاتے اور ملحدان یورپ کو جواب علمی سطح پر دیتے مگر ایسا نہ ہو سکا۔

اصغر علی روحی مزید لکھتے ہیں کہ سرسید کو عمر کے آخری حصے میں ایک خبط سا پیدا ہو گیا تھا اور اسی میں ان کی عمر تمام ہوئی۔ وہ اپنی کم علمی کی وجہ سے یا جان بوجھ کر قرآن کے معنی و مفہوم میں اخفا کرتے رہے۔ ان کے ہاں ملحدان یورپ کے چند باطل نظریات کو بنیاد اور معیار سمجھ لیا گیا اور انھی پر انھوں نے آیاتِ قرآنیہ کو پرکھنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ کے کچھ مفاہیم و معانی آیات قرآنی سے وابستہ کر دیئے اور اسلام کے اصل عقائد و نظریات سے روگردانی کے مرتکب ہوئے۔ انھوں نے ملائکہ، جن، معجزات انبیا جنت اور دوزخ وغیرہ کے تصورات کی نفی کی اور آیاتِ قرآنی

کے معانی و مفاہیم کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی کوشش کی۔

اس حوالے سے اصغر علی روحی رقم طراز ہیں:

''سچ پوچھو تو سید صاحب کو ایک خبط سا ہو گیا تھا، بس اسی میں آپ کی عمر صرف ہو گئی اور فہم معانی قرآن مجید میں اپنی کم لیاقتی سے یا جان بوجھ کر اخفائے حق کرتے رہے ــــ سید صاحب علم اصول سے ناواقف تھے۔ ان کے ہاں ملحدان یورپ کی چند باتیں معیار سمجھی گئی ہیں، انھی پر آیات قرآنیہ کو پرکھنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جابجا ٹھوکریں کھاتے چلے گئے۔''[۴۳]

ڈاکٹر اے۔ ایچ۔ کوثر نے سرسید احمد خاں کے بعض نظریات کی تحسین کی ہے اور بعض پر کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جدید مذہبی نظریہ فکر سرسید کی عظمت کی دلیل ہے۔ انھوں نے اسلام کی تعلیمات اور پیچیدہ مسائل کو جس عقل و فہم اور شرح کے ساتھ واضح کیا اور غیر ضروری جزئیات کو مذہب سے خارج کیا وہ انھی کا حصہ ہے۔ ایسے نازک دینی نظریات کی تصحیح کا کام سرسید جیسا باحوصلہ، باہمت اور عقل و فہم رکھنے والا انسان ہی کر سکتا تھا۔

وہ مزید لکھتے ہیں کہ ان کے جدید اسلامی نظریات کی بنیاد تمام تر اسلامی اصولوں پر ہی ہے۔ لیکن جہاں انھوں نے آیاتِ قرآنی کے مفاہم کو کھینچ تان کر علوم جدیدہ کے مطابق دکھانے کی کوشش کی اصل خرابی اسی سے پیدا ہوئی۔ اس کوشش میں ایک طرف تو کلام الٰہی کی حیثیت ان انسانی علوم کے مقابلے میں ثانوی ہو گئی اور دوسرے یہ کہ وہ علوم جو خود ابھی تجرباتی دور سے گزر رہے تھے اور جن میں مسلسل تبدیلیاں ہو رہی تھیں ایسے علوم کے ساتھ کلامِ الٰہی کی مطابقت دکھانا کلام الٰہی کی عظمت کے خلاف تھا اور کسی بھی حوالے سے مناسب نہ تھا۔ یہ سرسید کی بہت بڑی غلطی اور کمزوری تھی سرسید احمد خاں نے مذہبی مسائل کی وضاحت کرتے وقت حد سے زیادہ عقل سے کام لے کر اجتہادی غلطیاں کی ہیں۔ لیکن چونکہ انسان خطا کا پتلا ہے اس لیے ان سے غلطیاں ہوئیں۔ وہ کوئی عالم دین نہ تھے اس لیے ان سے یہ غلطیاں سرزد ہوئیں۔ انھوں نے سیاسی مفاہمت کی تکمیل کے لیے مذہبی مفاہمت کا راستہ نکالا تھا مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر اے۔ ایچ۔ کوثر لکھتے ہیں:

''جہاں انھوں نے ان اصولوں کی مدد سے آیات قرآنی کے مفہوم کو کھینچ تان کر علوم جدیدہ کے مسائل کے مطابق کر دکھانے کی کوشش کی ہے، اس سے نہ صرف علوم جدیدہ کے مقابلے میں قرآن شریف کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے بلکہ ایسے دنیاوی علوم و نظریات سے مطابقت دکھانا جو نئے نئے تجربوں، زمانہ وحالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں، کلام الٰہی کی عظمت کے خلاف ہے اور کسی اعتبار سے بھی مناسب نہیں۔ یہ سرسید کی غلطی اور کمزوری تھی۔ اسی طرح بعض مذہبی مسائل کی وضاحت میں انھوں نے حد سے زیادہ عقل سے کام لے کر اجتہادی غلطیاں بھی کی ہیں۔''[۲۴]

پروفیسر ثریا حسین نے سرسید احمد خاں کے مذہبی نظریات پر نکتہ چینی کی ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے سر ولیم میور کی کتاب **لائف آف محمد** اور سرسید کی **خطباتِ احمدیہ** کے حوالے سے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ولیم میور چاہتا تھا کہ اس کے ہم وطن ان اصولوں سے فائدہ اٹھائیں جن کے باعث پیغمبر اسلام اور ان کے خلفاء نے کامیابیاں حاصل کیں۔ اس نے اسلام سے قبل عربوں اور خصوصاً اہل مکہ کی تجارتی سرگرمیوں کا وسیع مطالعہ کیا اور ان واقعات کے حوالے سے معروضی انداز میں لکھا۔ اس نے اپنی کتاب میں آنحضرتؐ کے لیے بکثرت پیغمبر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ہم بے شک ولیم میور کے اخذ کردہ نتائج سے متفق نہ ہوں مگر ہم اسے شر پسند یا شدت پسند قرار نہیں دے سکتے۔ نبی کریمؐ کی حیاتِ مبارکہ اور مذہب اسلام سے متعلق مغربی زبانوں میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اگر ان کتب سے ولیم میور کی کتاب کا تقابل کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ولیم میور کی کتاب کا رویہ خاصا ہمدردانہ ہے اور یہ کتاب کہیں کہیں اسلام کا دفاع کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ولیم میور کی کتاب سے اگر **خطباتِ احمدیہ** کا تقابل کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ سرسید احمد خاں اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ مثلاً انھوں نے اپنی کتاب میں عرب کی تجارتی سرگرمیوں کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا جس پر ولیم میور نے بڑا زور دیا تھا اور اس کے خیال میں پیغمبر اسلام ﷺ کی کامیابیوں کا اولین سبب تھیں۔ ولیم میور نے اپنی طرف سے اسلام پر کوئی خاص اعتراض نہیں کیا تھا بلکہ اس نے محض قدیم عربوں کے بیانات کو نقل کر دیا تھا۔ ان بیانات سے چونکہ سرسید احمد خاں متفق نہ تھے اس لیے

انھوں نے اسی حوالے سے طویل بحث کی۔ اس بحث سے ان کے خیالات کی توجیہہ تو ہو جاتی ہے مگر ولیم میور کے بیانات کی تردید ہرگز نہیں ہوتی۔

پروفیسر ثریا حسین نے مزید لکھا ہے کہ سرسید عقلیت پسند اور آزاد خیال مفکر تھے۔ انھوں نے قرآن مجید کی تفسیر لکھتے وقت کسی کی رائے کو قبول نہیں کیا بلکہ ان نظریات کو پیش کیا جو ان کے دل و دماغ میں آئے۔ نبی کریم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ سے متعلق جو واقعات کتبِ حدیث اور پرانی تاریخ کی کتابوں میں مذکور تھے ان کی سرسید کے نزدیک کوئی وقعت اور قدر و قیمت نہ تھی۔ وہ اگر کسی واقعے کو اپنی عقل کے مطابق نہ پاتے تھے یا اس کی عقلی توجیہہ نہ کر سکتے تھے تو کہہ دیتے کہ وہ واقعہ بالکل درست نہیں ہے اور پیغمبر اسلام نے وہ کام نہیں کیا تھا۔ پروفیسر ثریا حسین نے اس حوالے سے لکھا ہے:

> ''وہ (سرسید) عقلیت پسند اور آزاد خیال (لبرل) مفکر تھے۔ جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے وہ کسی کی رائے کے پابند نہیں بلکہ اپنی ذاتی رائے رکھتے تھے جو عام طور پر اُن کی افتادِ طبع کی اپج ہوتی تھی۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی کے جو واقعات پرانی تاریخ حدیث کی کتابوں میں ملتے ہیں ان کی سید احمد کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ اگر کسی واقعہ کی عقلی توجیہہ نہیں کر سکتے تو کہہ دیتے کہ وہ واقعہ سرے سے غلط ہے اور پیغمبر اسلام ﷺ نے وہ کام نہیں کیا تھا۔''[۲۵]

خلیق احمد نظامی نے سرسید احمد خاں کے نظریات کے حوالے سے مفصل اظہار خیال کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ سرسید احمد خاں کے عقیدت مندوں نے سرسید کے ان تاثرات کو جو گرد و پیش کے حالات کا وقتی ردِ عمل تھے اور جن کی حیثیت بالکل وقتی تھی ان کو سرسید کی فکر کا بنیادی فلسفہ سمجھ لیا اور ان کی فکر کا وہ پہلو نظر انداز ہو گیا جس پر وہ معاشرے اور سیاست کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے۔ آج بھی سرسید کی بنیادی فکر کے حوالے سے بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں بلکہ بعض غلط فہمیوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ آج سرسید کے عقیدت مندوں کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو سرسید احمد خاں سے ان تصورات کو بھی منسوب کر دیتا ہے جن کا سرسید کی فکر سے کوئی تعلق نہیں اور جو غلط فہمی ان کے عقیدت مندوں کی طرف سے پھیلائی جاتی ہے اس کو دور کرنا مخالفوں کے نظریات کا مقابلہ کرنے

سے زیادہ مشکل اور دشوار ہو جاتا ہے۔

خلیق احمد نظامی مزید لکھتے ہیں کہ سرسید کے حوالے سے یہ غلط فہمی بھی پائی جاتی ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کو انگریزوں کی غلامی اور سیاسی حقوق کے حصول کی جدوجہد سے علیحدگی کا سبق پڑھایا تھا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت سرسید کا خیال تھا کہ مسلمان پہلے مغربی علوم حاصل کر کے ترقی کی منازل طے کریں اور پھر کارزارِ سیاست کا رخ کریں۔ اگر ابتدا ہی سے وہ کارزارِ سیاست میں پھنس گئے تو قوم کی تعلیمی حالت بہتر نہیں ہو سکے گی اور پھر کوئی راہ ان کی ترقی کی پیدا نہیں ہو سکے گی۔ یہ تجزیہ بالکل درست تھا۔ یہی بات پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی لکھی ہے۔ وہ اپنی سوانح حیات میں لکھتے ہیں کہ سرسید کا مسلمانوں کو سیاست سے علیحدہ رہنے کا مشورہ اور مغربی تعلیم پر زور دینا، اِن کی فکر کی صحیح انقلابی سمت کو ظاہر کرتا ہے۔

وہ مزید لکھتے ہیں کہ سیکولرزم سرسید کی زندگی کی حقیقت تھی۔ سرسید نے قحط کے دوران مرادآباد میں اپنے عمل سے ہندوؤں کے دل جیت لیے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ جب کالج کے ٹرسٹیوں نے فسٹ آنے والے مسلمان طلبا کے لیے انعام اور وظائف مقرر کیے تو انھوں نے خود اپنی جیب سے ہندو فسٹ آنے والے طالب علموں کے لیے انعام کا اعلان کیا تھا۔

سرسید کی فکر کا ایک اور پہلو ان کا تصورِ قومیت ہے۔ سرسید نے بار بار اسی بات پر زور دیا کہ ہندستان میں بسنے والے سب لوگ ایک قوم ہیں۔ بعد میں یہی بات مولانا حسین احمد مدنی نے بھی کی۔ بعض لوگوں نے اردو ہندی تنازعہ کو غلط سمجھا اور غلط پیش کیا۔ سرسید سمجھتے تھے کہ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ سماجی اور لسانی جدوجہد کا ثمر ہے اور اس سے علیحدگی متحدہ قومی نظریہ کے منافی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح متحدہ قومیت کا جذبہ سرد پڑ جائے گا۔

خلیق احمد نظامی کے ہاں سرسید سے مذہبی موافقت کا پہلو بھی پایا جاتا ہے۔ خلیق احمد نظامی سادہ مگر استدلالی اسلوب میں سرسید کی مذہبی خدمات کو زیرِ قلم لائے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''سرسید نے مذہبی معاملات میں عقلیت، کشادہ ذہنی اور بے تعصبی کو رہبر بنا کر مسائل کو حل کرنا چاہا۔ غالباً ہندوستان میں وہ پہلے شخص تھے جس نے مذاہب کے تقابلی مطالعہ کی قدر و قیمت کو پہنچانا۔ ان کی انجیل کی تفسیر

(تبین الکلام) اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے اور اس سے ایک نئے اندازِ فکر کا آغاز ہوتا ہے۔ اگر سرسید کچھ عرصہ اور زندہ رہتے تو یہی اندازِ فکر ہندو مذہب کے مطالعہ کی طرف اختیار کرتے۔ [۲۶]

خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ سرسید نے **خطبات احمدیہ** لکھ کر تحقیق کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا تھا وہ لائق تحسین ہے۔ لیکن قرآن مجید کی تفسیر لکھتے وقت انھوں نے جو انداز اختیار کیا وہ ان کی مغربی علوم سے دینی رعب میں اظہار ہے۔ مذہب اور سائنس کی بحث میں وہ اس طرح الجھے کہ سائنس کے نظریات کے مطابق مذہب کی توجیہات کرنے کی کوشش کی۔ ان کی یہ کوشش غیر ضروری بھی تھی اور نا قابل فہم بھی۔ کیونکہ سائنس کے نظریات گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ مذہب کو ان نظریات کے مطابق ڈھالنا بہت غلط اور خطرناک تھا۔ کیونکہ مذہب اور سائنس دونوں کی حدود مختلف ہیں۔ اس حوالے سے خلیق احمد نظامی رقم طراز ہیں:

''سرسید نے **خطبات احمدیہ** لکھ کر جس طرح میور کا مقابلہ کیا تھا، اور مستشرقین کے حملوں سے مدافعت کا سامان مہیا کیا تھا، اور تلاش و تحقیق کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا تھا، وہ اپنی جگہ لائق ستائش واعتراف ہے لیکن تفسیر قرآن میں انھوں نے جو رنگ اختیار کیا، وہ مغربی علوم سے ذہنی مرعوبیت کو ظاہر کرتا ہے۔ مذہب اور سائنس کے معرکہ میں وہ اس طرح داخل ہوئے کہ سائنس کے نظریات کو مذہب کے مطابق ثابت کرنے کے لیے وہ توجیہات کیں جو نا قابلِ قبول بھی تھیں اور غیر ضروری بھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اپنے ابتدائی زمانہ میں سرسید کی تفسیر سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ وجہ غالباً یہ تھی کہ اس کا استدلالانہ انداز گفتگو اُن کے اس وقت کے مزاج کے مطابق تھا، لیکن جب ''ترجمان القرآن'' لکھنے کا وقت آیا تو فکر و نظر کے زاویے بدل چکے تھے۔ انھوں نے سرسید کا نام لیے بغیر ان کے طرز فکر کی پوری مخالفت کی ہے اور لکھا ہے کہ سائنس کی Theories دن رات بدلتی رہتی ہیں۔ مذہب کو ان کے مطابق ڈھالتے رہنا خطرناک تجربہ ہے۔ مذہب اور سائنس دونوں کے میدان

علیحدہ علیحدہ ہیں۔''[۲۷]

ڈاکٹر ذاکر حسین نے بھی سر سید احمد خاں کے مذہبی خیالات کے حوالے سے اظہار خیال کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ جہاں سر سید احمد خاں کے مذہبی نظریات سے ان کے اپنے دور کے علماء اُن کے رفقائے کار اور عام مسلمانوں نے اختلاف کیا وہاں ان کے بعد آنے والوں نے بھی سر سید احمد خاں کے مذہبی نظریات کو قبول نہیں کیا۔ خود علی گڑھ کالج کے بہت سے طلبہ ایسے ہیں جنھوں نے سر سید احمد خاں کے مذہبی نظریات کو قبول نہیں کیا اور ان کے اور سر سید احمد خاں کے مذہبی نظریات ایک دوسرے سے قطعاً مختلف تھے۔ علی گڑھ کالج کے سر سید دور کے طلبہ تو شاید سر سید کے مذہبی خیالات و نظریات سے متفق ہوں لیکن بعد کے ادوار سے تعلق رکھنے والے طلبہ سر سید کے مذہبی خیالات سے وابستہ نہیں رہے اور انھوں نے سر سید کے مذہبی خیالات سے کسی قسم کا کوئی تعلق یا واسطہ نہیں رکھا۔ جن لبرل خیالات کا اظہار سر سید نے کیا تھا ان کی مخالفت ان کی اپنی زندگی میں ہی شروع ہو گئی تھی اور آج بھی جاری ہے۔ خود علی گڑھ سے وابستہ افراد بھی سر سید کے مذہبی خیالات کے مقلد نہیں بلکہ ان کے نظریات سر سید سے کافی حد تک مختلف ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ذاکر حسین نے لکھا ہے:

> ''ایسے لوگ معقول تعداد میں کبھی نہیں رہے جنھوں نے مذہبی افکار میں سر سید کے ساتھ اتفاق کیا ہو۔ طلبائے علی گڑھ کی پچھلی نسلیں شاید اس سے مستثنیٰ ہوں لیکن ان کے بارے میں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اس مصلح نے ترجمانی مذہب کے معاملے میں جن لبرل خیالات اور مذہبی رواداری سے کام لیا اس کو انھوں نے مذہب سے اپنی بے پروائی کے واسطے ایک سہل جواز کے طور پر تو استعمال نہیں کیا۔ آج کے علی گڑھ کے متعلق اگر کوئی صحیح بات کہی جا سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ اسے اپنے بانی کے خیالات کے مذہبی پہلو سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔''[۲۸]

پروفیسر رشید احمد صدیقی کا شمار ممتاز اہل قلم میں ہوتا ہے۔ وہ عمر بھر علی گڑھ سے وابستہ رہے مگر سر سید کے افکار و خیالات سے متفق نہ ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سر سید کی ہندو اور ہندوستان سے دوستی بہت گہری تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے سید جمال الدین افغانی کا ساتھ نہیں دیا

جو عالم اسلام کے اتحاد کے قائل تھے اور اس سلسلے میں بلادِ اسلامیہ کے دورے پر نکلے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے سر سید احمد خاں سے تعاون کی درخواست بھی کی تھی مگر انھوں نے سید جمال الدین افغانی کا ساتھ نہ دیا بلکہ ان کے نظریہ سے اتفاق بھی نہیں کیا۔ اس کے خلاف سر سید نے ہمیشہ ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا بلکہ تبلیغ کی کہ وہ اپنی فلاح کا راستہ ہندوستان کے اندر تلاش کریں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے یہ بھی لکھا کہ مسلمانانِ ہند نے کچھ عرصہ تو انگریزی حکومت کے عتاب کو جھیلا مگر پھر چھوٹی بڑی نوکریوں پر فائز ہونے لگے اور ایک حد تک اطمینان محسوس کرنے لگے مگر یہ رجحان بہت مضر ثابت ہوا۔ مسلمانوں نے نوکری کے نشے میں ایک طرف تو وسیع تر ملکی و قومی مفاد کو نظر انداز کیا اور دوسری طرف انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر ان کی اندھی تقلید شروع کر دی۔ ایک طبقہ نقالی اور تقلید کر کے سمجھتا تھا کہ ہم نے سب کچھ پا لیا۔ ایک دوسرا طبقہ بھی تھا جس نے اس صورتحال کو صحیح طرح سے پہچانا اور اس کے خلاف اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کیا۔ ان میں ایک کا نام بہت اہم ہے۔ انھوں نے اس صورتحال کا تجزیہ کیا، اس کو پہچانا اور اس کے خلاف طنزیہ و ظریفانہ انداز میں اظہار خیال کیا۔ اکبر نے علی گڑھ کی انگریزی تقلید کی پالیسی کے خلاف کھل کر تنقید کی اور مسلسل کی۔ اکبرالہٰ آبادی علی گڑھ میں دی جانے والی انگریزی اور جدید علوم کی تعلیم کے خلاف نہ تھے بلکہ وہ علی گڑھ والوں کی انگریزوں کی اندھی تقلید اور مضحکہ خیز نقالی کے خلاف تھے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی یہ بھی لکھتے ہیں کہ سر سید احمد خاں جس طرح انگریزوں اور انگریزی حکومت کی تقلید کرتے تھے اور ان سے متاثر تھے اس سے نہ تو حالی اور شبلی متفق تھے اور نہ مولوی نذیر احمد۔ اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ یہ تینوں مولوی تھے۔ آنے والے دور نے یہ بات ثابت کی کہ جہاں تک مغربیت اور اس کے بداثرات سے بچنے اور اس سے احتیاط کا سوال تھا اس میں سر سید اور سید امیر علی سے زیادہ صاحبِ نظر مولویوں کا طبقہ نکلا۔ حالی، شبلی اور مولوی نذیر احمد نے ابتدا میں ہی یہ بھانپ لیا تھا کہ تقلیدِ مغرب کے کیا اثرات سامنے آئیں گے۔ اسی طرح اکبر کا نقطۂ نظر بھی بہتر اور مبنی بر حقیقت تھا۔ وہ سر سید سے زیادہ دور تک دیکھ سکتے تھے۔ اس حوالے سے پروفیسر رشید احمد صدیقی رقم طراز ہیں:

''سرسید جس طرح یا جس حد تک مغربیت سے متاثر تھے اس سے نہ حالی کو اتفاق تھا، نہ شبلی کو، نہ نذیر احمد کو۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ تینوں مولوی تھے لیکن پچاس سال بعد معلوم یہی ہوا کہ جہاں تک مغربیت سے احتیاط برتنے کا سوال تھا، سرسید اور سید امیر علی دونوں سے یہ طبقہ زیادہ صاحب نظر نکلا!.......اکبر سرسید سے زیادہ دیکھتے تھے اور سرسید سے زیادہ دور تک دیکھتے تھے...... سرسید جس مغربیت کے حامی تھے، اس نے بالآخر خود اپنے سے پناہ مانگنی شروع کر دی۔ زیادہ دور تک دیکھنے کا صحیح طریقہ یا مفہوم یہ ہے کہ جتنا آگے دیکھ سکتا ہو اتنا ہی پیچھے بھی دیکھ سکتا ہو اور یہ صرف اس طرح ممکن ہے کہ زیادہ بلند ہو کر اور زیادہ علیحدہ ہو کر دیکھے۔[۲۹]

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی معروف ماہر تعلیم اور محقق ہیں۔ انھوں نے جہاں دوسرے موضوعات پر لکھا وہاں ان کی ایک پہچان اقبال شناس کے طور پر بھی ہے۔ انھوں نے سرسید احمد کے افکار و خیالات کا بھی جائزہ لیا اور ان کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ سرسید احمد خاں مسلمانوں کی بھلائی اسی میں سمجھتے تھے کہ وہ انگریزی طور طریقے اختیار کریں۔ مغرب کی تقلید کریں اور انگریزوں کی وفادار رعایا بن کر رہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ برطانوی حکومت کا استحکام مسلمانان برصغیر کے لیے نہایت مفید تھا۔ اسی روش نے سرسید کو عقل پرست بنا دیا اور پھر انھوں نے مذہب کی تعبیر و تشریح بھی بذریعہ عقل کرنا چاہی۔ ان کا خیال تھا کہ مذہب کو عقل کے مطابق اور تقاضائے وقت سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ یوں وہ سیاسی اور مذہبی دونوں حوالوں سے مغرب سے مرعوب ہوئے اور اس کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو گئے۔ سرسید کا یہ ذہنی رویہ مغرب کے سامنے کامل اطاعت گزاری کے سوا کچھ اور نہیں۔

ڈاکٹر ہاشمی مزید لکھتے ہیں کہ سرسید احمد خاں تقلید کے زبردست مخالف اور اجتہاد کے داعی تھے مگر مغرب کی پیروی میں انھوں نے بالکل الگ روش اختیار کی اور مغرب کی کامل تقلید کی۔ سرسید اپنی قوم کے ساتھ دردمندی رکھتے تھے اور اس حوالے سے ان کی ذات پر شبہ کرنا مشکل ہے۔ مگر وہ انگریزی حکومت کی مکارانہ حکمت عملی کا ایسا شکار ہوئے کہ انگریزی حکومت کے دفاع کے لیے انھوں نے اپنی تمام صلاحتیں وقف کر دیں۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے

دوران بڑی جان فشانی سے انگریزی حکومت کی مدد کی اور انگریزی وفاداری کا ثبوت دیا اور صرف اس پر بس نہیں کیا بلکہ انگریزی حکومت کے خلاف آزادی کی جنگ لڑنے والے مجاہدین کو بھی خوب گالیاں دیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی رقم طراز ہیں:

> ''سر سید کے اخلاص اور اپنی قوم کے لیے ان کی دردمندی میں شبہ کرنا مشکل ہے مگر ان کی ذہنی افتاد نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ انگریزی حکومت کو دوام بخشنے کے لیے وہ ان کی ''مکارانہ حکمتِ عملی'' کا شکار ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انھوں نے نہایت جانفشانی سے انگریزی حکام کی مدد کی، پرچہ نویسی کی خدمات بھی انجام دیں...... انگریزوں کی وفاداری میں انھوں نے اس حد تک غلو برتا کہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف مزاحمت کرنے والوں کو جاہل، بدمعاش، بے علم، حرام زادے، نمک حرام اور نامحمود قرار دے ڈالا۔''[۳۰]

ریاض الرحمٰن شروانی کا شمار ہندوستان کے ممتاز اہل قلم میں ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سر سید احمد خاں کی شخصیت اور ان کے افکار کے حوالے سے پاکستان اور ہندوستان کے اہل قلم کے رویوں میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہندوستان سے تعلق رکھنے والے اہل قلم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ سر سید کی انگریز دوستی ان کے تعلیمی مشن کی تکمیل کے لیے ضروری تھی اور وہ ہندوؤں کے ساتھ مکمل اتحاد کے قائل تھے البتہ اس میں اردو ہندی تنازعے کی وجہ سے رخنہ پڑ گیا تھا۔ جبکہ پاکستان سے تعلق رکھنے والے اہل قلم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہندوؤں کی نسبت انگریزی حکومت سے رشتہ استوار کرنا لازمی تھا اور یہ کہ سر سید احمد خاں دو قومی نظریے اور علیحدگی پسندی کے نظریے کے بانی تھے۔ ان دونوں نقطہ ہائے نظر کا حقائق کی روشنی میں جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔

ریاض الرحمٰن شروانی مزید لکھتے ہیں کہ سر سید کمپنی سرکار کے ملازم تھے اس لیے انھوں نے جنگ آزادی کے دوران جان کی بازی لگا کر انگریزوں کی حفاظت کی اور مجاہدین آزادی کے لیے انتہائی نامناسب زبان استعمال کی۔ ایسی زبان جو کسی ہندوستانی کے شایان شان نہ تھی۔ مزید یہ کہ انگریزی حکومت نے ہندوستانیوں پر جو ظلم و ستم کیا اس کی مذمت سر سید احمد خاں نے اس انداز میں نہ کی جیسے کرنی چاہیے تھی۔ جہاں تک سر سید احمد خاں کے مذہبی عقائد و نظریات کا تعلق تھا وہ

بلا شبہ ایک پکے اور سچے مسلمان تھے۔ وہ مذہب کی تفہیم میں عقل وفکر اور تدبر پر زور دیتے تھے لیکن وہ عقل پر جتنا زیادہ زور دیتے تھے اور جتنا زیادہ انحصار کرتے تھے مذہب میں عقل اتنی دور تک ساتھ نہیں دیتی۔ کیونکہ عقل کی ایک حد ہے اور جب وہ اس سے تجاوز کرتی ہے تو دشواری پیش آتی ہے۔ اس حوالے سے ریاض الرحمٰن شروانی لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک ان کے مذہبی عقائد کا تعلق ہے، وہ بلا شبہ ایک پکے اور سچے مسلمان تھے: موحد کامل، عاشقِ رسول ﷺ، فرائض کی ادائیگی کے پابند اور مسلمانوں کے حقیقی خیر خواہ۔ ان کا اصرار مذہب کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے اور اس کی روشنی میں دیکھنے سمجھنے پر تھا۔ بالخصوص وہ قرآن فہمی میں تعقل، تفکر اور تدبر پر بہت زور دیتے تھے ـــــــ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ عقلیت کو جتنی دور تک لے گئے، مذہب میں عقلیت اتنی دُور تک نہیں جاتی ہے۔ عقلیت کی حدود ہیں اور جب وہ ان سے تجاوز کرتی ہے تو دشواریاں پیش آتی ہیں۔''[۳۱]

زاہد چودھری نے بھی سرسید احمد خاں اور ان کے نظریات کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ بہت سے مؤرخین کا کہنا ہے کہ سرسید احمد خاں تحریک پاکستان کا قائدِ اول تھا کیونکہ اس نے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک الگ قوم ہونے کا تصور دیا تھا اور یہ پیش گوئی کی تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا سیاسی اتحاد ممکن نہیں ہوگا۔ اس قسم کے جتنے بھی مورخین ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ دوقومی نظریے کا تصور پیش کر کے سرسید نے نظریہ پاکستان کی بنیاد رکھی انھیں سرسید احمد خاں کے ان بیانات کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے جن میں سرسید نے کہا تھا کہ مذہب کا دنیاوی امور سے کوئی تعلق نہیں اور مزید یہ کہ ہندو اور مسلمان باعتبار وطن ایک قوم ہیں۔ ایسے مؤرخین سرسید کی ان تقریروں کا حوالہ نہیں دیتے جن میں سرسید نے برصغیر کو ایک کثیر الاقوامی بلکہ کثیر الممالک خطہ قرار دیا تھا۔ لہٰذا سرسید کو دوقومی نظریے اور تحریکِ پاکستان کا قائدِ اول قرار دینا درست نہیں۔

یہ بات درست ہے کہ سرسید مسلمانوں کے بہت بڑے خیر خواہ تھے لیکن ان کے ذہن میں قوم یا قومیت کا کوئی واضح تصور نہ تھا۔ کبھی تو وہ ہندوستان کو کثیر القومی ملک قرار دیتے ہیں، کبھی

کثیر المما لک کا خطہ گردانتے ہیں، کبھی ہندوؤں اور مسلمانوں کو مذہب کی بنیاد پر الگ قوم قرار دیتے ہیں اور کبھی یہ کہتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان چونکہ ایک ہی ملک کے رہنے والے ہیں لہٰذا وہ ایک ہی قوم ہیں۔

سرسید احمد خاں کے اگر مذہبی نظریات کا جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے مذہبی عقائد و نظریات کے اظہار میں کبھی جھجک محسوس نہیں کی۔ انھوں نے بار بار اس بات کا اعلان کیا کہ وہ انبیائے کرام کے معجزات، جسمانی معراج النبی، شق الصدر، جنوں، فرشتوں، شیطان، جنت، دوزخ اور قیامت کے بارے میں مروجہ اسلامی نظریات کے قائل نہیں کیونکہ اِن عقائد کی بنیاد یہودیوں کے قصے، کہانیوں پر ہے۔ ان کے ان نظریات پر روایتی علماء نے بھر پور احتجاج کیا مگر سرسید احمد خاں اپنے اِن تصورات پر ڈٹے رہے اور تن تنہا ملائیت کا مقابلہ کیا۔ سرسید اسلام کو مکمل ضابطہ حیات تسلیم نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے یہ انسان کا ذاتی معاملہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانانِ ہند کی ایک بڑی تعداد نے ان کا ساتھ دیا کیونکہ وہ سرسید کو اپنا محسن اعظم سمجھتے تھے۔ اس حوالے سے زاہد چودھری لکھتے ہیں:

> ''سرسید اپنے مذہبی عقائد کے اظہار میں الفاظ کا کوئی ہیر پھیر نہیں کرتا تھا۔ وہ برملا اور بار بار اعلان کرتا تھا کہ وہ معجزات جسمانی معراج النبی، شق الصدر، فرشتوں، جنوں، شیطان، مذاہب اربعہ، جنت، دوزخ اور قیامت کے بارے میں روایتی عقائد کو نہیں مانتا اور یہ رائے رکھتا ہے کہ ان سب عقائد کی بنیاد یہودیوں کے بے بنیاد قصوں کہانیوں پر ہے۔ چونکہ صدیوں سے ملاؤں کی مذہبی دکانیں ان روایتی عقائد کے زور پر چلتی رہی تھیں اس لیے جب انھوں نے دیکھا کہ سرسید قومی فلاح و بہبود کا پرچم اٹھا کر دیرینہ کاروبار کو تباہ و برباد کرنے کا عزم رکھتا ہے تو انھوں نے اس کی مخالفت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ ملاؤں نے اپنے ترکش کے سارے زہریلے تیر استعمال کیے اور دشنام طرازی کی ساری حدود کو عبور کیا، مگر سرسید کا کارواں تھا کہ آگے ہی بڑھتا چلا گیا۔ سرسید نے تن تنہا ملاؤں کے عظیم لشکر کو شکست فاش دی اور اس کی زندگی میں اس کے سامنے کسی مُلا

کا چراغ نہ جل سکا۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ تھی کہ ملاؤں کی مذہبی سیاست اس وقت کے مسلمانان ہند کے تقاضوں سے متصادم تھی اور سرسید احمد خاں کی سیکولر یا لادینی سیاست ان کی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی ضرورتیں پوری کرتی تھی۔'' [۳۲]

پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی نے سرسید احمد خاں اور ان کی شخصیت کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان کا جذبہ اصلاح بڑا صادق اور مخلصانہ تھا۔ ان میں مسلمانوں کی دنیاوی ترقی کے حوالے سے بڑا جوش اور جذبہ تھا۔ وہ بڑے ذہین اور محنتی بھی تھے۔ ان کے اندر تحریر و تقریر کی بھی بے پناہ صلاحیت تھی۔ وہ ارادوں کے مضبوط اور دھن کے پکے تھے مگر ان کے اندر بعض کمزوریاں اور خامیاں بھی تھیں۔ وہ یہ کہ ایک تو وہ باقاعدہ مذہبی علوم کے ماہر نہ تھے لہٰذا قرآنِ مجید کی تفسیر لکھتے وقت جا بجا ٹھوکریں کھائیں۔ ان کا وجدان نہ تو ان کی عقل پسندی پر غالب آ سکا اور نہ ہی ان کو الحادی فلسفے کی دلدل سے نکال سکا۔ مزید یہ کہ وہ فلسفہ جدید کے ماہر نہ تھے اسی لیے وہ نہ تو مذہب کو پوری طرح سمجھ سکے اور نہ ہی فلسفہ جدید کے مباحث کا اچھی طرح ادراک کر سکے۔ اس حوالے سے سعید احمد اکبرآبادی رقم طراز ہیں:

''سرسید کا جذبہ اصلاح صادق اور بڑا مخلصانہ تھا۔ ان میں بڑا سچا جوش تھا، ولولہ تھا، عزم تھا، بڑے ذہین اور محنتی تھے، تحریر کی قوت بے پناہ تھی، دھن کے پکے اور ارادہ کے مضبوط تھے لیکن بایں ہمہ اوصاف ان میں بڑی خامی یہ تھی کہ

(۱) انھوں نے علوم اسلامیہ کا مطالعہ اور ان کا اکتساب نہ اُنھیں مقصود بالذات سمجھ کر کیا تھا اور نہ باقاعدہ کیا تھا۔ اس بنا پر ان کا مذہبی وجدان آگے چل کر نہ ان کے تعقل پر غالب آ سکا اور نہ فلسفہ کے دلدل سے ان کو بچا سکا۔

(۲) انھوں نے علوم جدیدہ اور خاص طور پر فلسفہ جدیدہ کا بھی مطالعہ دقتِ نظر سے نہیں کیا تھا ورنہ کچھ اور نہیں صرف امانوئل کانٹ کی کتاب ''تنقید عقل'' کا بھی وہ غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کر لیتے تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ....... تہذیب نو، افکارِ جدید اور فلسفہ و سائنس سے مرعوب اور جمہور علمائے اسلام کے مسلک سے منحرف ہو کر اسلامی حقائق کی غیر معروف

ومتداول توجیہہ وتاویل کرنے پر مجبور ہوتے۔ اس بنا پر سرسید کی اسلامی فکر میں خود پختگی اور استواری پیدا نہیں ہوسکی۔ علوم جدید کا اور تہذیب نو کا اُن پر جتنا دباؤ زیادہ پڑتا رہا اسی کے مطابق ان کے افکار اور بعض مسائل کی نسبت ان کی رائے میں مدوجزر اور انقلاب وتغیر ہوتا رہا۔" [۳۳]

پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی کے بقول سرسید احمد خاں نے خطبات احمدیہ بڑی محنت اور خلوص سے لکھی۔ اس کتاب میں بھی ان کے ہاں آزادخیالی کی تھوڑی بہت جھلک موجود ہے لیکن ان کی آزادخیالی تفسیر قرآن میں حد سے تجاویز کرگئی اور انھوں نے کئی ایسے عقائد ونظریات کو ماننے سے انکار کردیا جو دراصل اسلام کے بنیادی عقائد ہیں اور جن پر تمام علما اور عام مسلمان متفق تھے۔ اس حوالے سے سعید احمد اکبرآبادی لکھتے ہیں:

"اُن کی یہ آزادخیالی ان کی تفسیر میں اپنے شباب کو پہنچ گئی ہے اور انھوں نے بعض مسائل: حیات شہدا، حضرت عیسیٰؑ کا بن باپ کے پیدا ہونا، قرآن مجید میں مختلف انبیا کے جو معجزے بیان کیے گئے ہیں وہ اور حضرت عیسیٰؑ کا رفع آسمانی، ابلیس اور ملائکہ، استرقاق اور تعدد ازدواج، میراث وغیرہ اور ان کے علاوہ بعض اور مسائل میں جو راہ اختیار کی ہے وہ بالکل الگ اور سب سے جدا ہے۔ اس میں سلف تا خلف علمائے حق اور اشاعرہ، ماتریدیہ یا معتزلہ، مقلد یا غیرمقلد کوئی ان کا شریک اور ساتھی نہیں ہے۔" [۳۴]

سرسید کی بطور مصلح قوم سراہنے والوں میں بابائے اردو مولوی عبدالحق اور رشید احمد صدیقی کے نام شامل ہیں۔ رشید احمد صدیقی، سرسید کے کارناموں کو نیم فلسفیانہ انداز میں اجاگر کرتے رہے ہیں اور مولوی عبدالحق نے غنائیہ شاعری کے انداز میں سرسید کو مصلح قوم قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"فرہاد کو شیریں سے اور نل کو دمن سے اتنا عشق نہ ہوگا جتنا کہ انھیں اپنی قوم سے تھا۔ سوتے، جاگتے، بیٹھتے، یہی ان کا ورد تھا۔ وہ بلا مبالغہ فنافی القوم کے درجے کو پہنچ گئے تھے۔ سرسید نے قوم کا مفہوم ہی بدل دیا۔ اس سے پہلے قوم سے مراد سید، شیخ، مغل، پٹھان تھی، سرسید نے اسے "نیشن"

کا ہم معنی بنادیا اور مسلمانوں میں قومیت کا تصور پیدا کیا۔"[۳۵]

ضیاء الحسن فاروقی سرسید کی شخصیت اور ان کے افکار و خیالات کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ سرسید نے مدرستہ العلوم کے قیام کے ساتھ ہی مسلمانانِ ہند کے لیے ایک آزاد مسلم یونیورسٹی کا خواب بھی دیکھا تھا۔ لیکن عموماً ایسا نہیں ہوتا کہ جیسا خواب انسان دیکھتا ہے اس کی تعبیر بھی ویسی ہی ہو۔ سرسید مرحوم کا بھی المیہ یہی تھا کہ علی گڑھ ویسا نہ ہو سکا جیسا انھوں نے خواب دیکھا تھا۔

فاروقی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ ہمارے خیال میں علی گڑھ کی کمزوری یہ تھی کہ اس نے جدید تہذیب کا تجزیہ کیے بغیر اور اس کی جانچ پرکھ کیے بغیر اس کو اپنا لینا اور اختیار کر لینا چاہا۔ اگرچہ علی گڑھ کے بانی سرسید احمد خاں نے تعقل و تدبر اور تفکر کا راستہ دکھایا تھا۔ اس راستے پر اگر علی گڑھ گامزن رہتا تو مسلمانوں کی زندگی میں قدیم اور جدید کی وہ تفریق پیدا نہ ہوتی جو آخر کار ہندوستان میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی راہ کا بھاری پتھر ثابت ہوا۔ اقبال نے اپنے وسیع علمی پس منظر کی بدولت مسلمانانِ ہند کے اس مسئلے کو سمجھا اور اس کے اصل راز کو جانا لیکن اقبال کے مذہبی افکار بھی بعض ناگریز وجوہات اور عصری مسائل پر اظہار کی وجہ سے دب گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی مذہبی و سیاسی فکر صحیح خطوط پر استوار ہوئی مگر اسے علی گڑھ والوں نے قبول نہ کیا کیونکہ ان کی سیاسی سوچ علی گڑھ والوں سے مختلف تھی۔ مسلمانانِ ہند کا یہی المیہ ہے کہ ان کی مذہبی، سیاسی سوچ میں ہم آہنگی پیدا نہ ہو سکی۔ آج بھی مسلمانانِ ہند کا یہی المیہ ہے کہ یہ اختلافات آج بھی ان کی مذہبی و تہذیبی اور سیاسی اجتماعی زندگی کا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اس حوالے سے ضیاء الحسن فاروقی لکھتے ہیں:

> "ہمارے خیال میں علی گڑھ کی کمزوری یہ تھی کہ اس نے جدید تہذیب کو بغیر کسی تنقید اور جانچ کے اپنا لینا چاہا، اگرچہ اس کے بانی نے تعقل اور تفکر کی راہ دکھا دی تھی جس پر اگر استقامت کے ساتھ غور و فکر کا سلسلہ جاری رہتا تو تعلیم یافتہ مسلمانوں کی عملی زندگی میں قدیم و جدید کی وہ تفریق پیدا نہ ہوتی جو انجام کار تہذیب اسلامی کی حقیقی نشاۃ ثانیہ کی راہ کا سنگِ گراں بن گئی۔ اقبال نے مسلمانوں کے اس تہذیبی بحران کا راز پا لیا تھا لیکن دیگر اسباب کے علاوہ........ سیاست کی ہنگامہ آرائیوں میں اقبال کا مذہبی فکر دب کر رہ گیا اور مولانا آزاد کے مذہبی و تہذیبی فکر کو، جو اصلی علی گڑھ

تحریک کی توسیع تھی، علی گڑھ نے اس لیے قبول نہیں کیا کہ سیاست میں
اس کا مسلک علی گڑھ والوں سے مختلف تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کا یہ بڑا
المیہ ہے کہ ان کا تعلیم یافتہ متوسط طبقہ، جس کی سیاسی قیادت کو ایک خاص
مرحلے پر علما اور صوفیا کی ایک بڑی تعداد نے تسلیم کرلیا تھا، مذہبی معاملات
میں تو قدامت پسند رہا لیکن تعلیم وتہذیب میں اس نے یہ حوصلہ کیا کہ ترقی
پسند کہلائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے اس طبقے کی اجتماعی
شخصیت میں، جسے قائدانہ کردار ادا کرنا تھا، ایک قسم کا دورخا پن پیدا ہو گیا
جو آج تک ان کی مذہبی، تہذیبی اور سیاسی، غرض پوری اجتماعی زندگی کا اہم
مسئلہ بنا ہوا ہے۔''[۳۶]

سید طفیل احمد منگلوری لکھتے ہیں کہ سرسید احمد خاں نے اصلاح معاشرت کے سلسلہ میں بکثرت مضامین لکھے۔ ان مضامین میں انھوں نے مسلمانوں میں رائج عادات ورسوم کو تنقید کا نشانہ بنایا اور ان کا مضحکہ اڑایا۔ سرسید نے ایسی بہت سی باتوں کو داخلِ اسلام کرنا چاہا جن کا اسلام سے تعلق نہ تھا۔ انگریزی حکومت کی خوشنودی کے حصول کے لیے انھوں نے گردن مروڑی مرغی کو حلال قرار دیا، جوتے پہن کر نماز پڑھنا، کھڑے ہو کر پیشاب کرنا، ڈاڑھی منڈوانا اور ایسی ہی اور کئی باتوں کو مذہبی حوالے سے جائز ثابت کرنے کی کوشش کی۔ سرسید کی اس قسم کی تحریروں کا اثر یہ ہوا کہ مسلمان سرسید کے نظریات سے متنفر ہونا شروع ہوئے اور مسلمانوں کا غم وغصہ بھڑک اٹھا۔ اس حوالے سے سید طفیل احمد منگلوری رقم طراز ہیں:

''سرسید نے اصلاح معاشرت کے سلسلہ میں بکثرت مضامین، کھانے اور
لباس کے متعلق، شائع کیے جن میں قدیم طریقوں کا مضحکہ اڑایا جاتا تھا
...... عیسائیوں کے ساتھ کھانے پینے میں چونکہ اُن کا ذبیحہ مانع تھا اس لیے
سرسید نے مسلمانوں کے لیے گردن مروڑی مرغی کا کھانا آیات واحادیث
سے جائز قرار دیا۔ جوتا پہن کر نماز پڑھنا عام طور پر معیوب تھا، کھڑے ہو کر
پیشاب کرنا اور ڈاڑھی منڈانا گناہ سمجھا جاتا تھا، ان سب چیزوں کے جواز کو
سرسید نے مذہب سے ثابت کرنے کی کوشش کی اور قبل اس کے کہ مسلمانوں

کی تعلیم اور ان کی حقیقی ترقی کے لیے دوسرے ذرائع اختیار کیے جاتے، اس قسم کی بحثوں سے سرسید سے مسلمان بالعموم بھڑک گئے۔ [۳۷]

سید طفیل احمد منگلوری مزید لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے مذہب یعنی مذہب اسلام کی یہ خصوصیت ہے اس میں عبادت اجتماعی حیثیت میں کی جاتی ہے۔ انفرادی عبادت صرف مجبوری کی حالت میں کی جاتی ہے۔ سرسید مسلمانوں کے مذہبی اجتماعات سے دور رہتے تھے اور خوشی کے موقع پر بھی مسلمانوں کی مفلسی اور جہالت کا سوگ مناتے تھے۔ عید کے دن مسلمانوں کی بربادی کے متعلق لکھتے تھے اور روزہ رکھنے والوں اور تراویح پڑھنے والوں کا مضحکہ اڑاتے تھے۔ سرسید کے ایسے ہی مذہبی خیالات کی وجہ سے لوگ ان سے متفق نہ تھے یہاں تک کہ جو ان کے احباب اور رفیق کار بھی تھے۔ ان کے ایسے ہی باطل خیالات کی وجہ سے ان کی مخالفت کی آگ بھڑک اٹھی اور علما نے کھل کر سرسید کے نظریات کی مخالفت کی۔ اس صورتحال میں دونوں طرف توازن قائم نہ رہا اور دونوں طرف سے خوب طنز کے تیر برسائے گئے۔ اسی رو میں سرسید نے تمام قدیم وجدید مفسرین اور علما کو خوب جلی کٹی سنائیں اور قدیم مفسرین کی روایات کو لغو اور بیہودہ قرار دیا اور انھیں یہودیوں کا مقلد قرار دے دیا۔ اسی بحث میں ایسی تحریریں سامنے آئیں جو دونوں کے لیے باعث شرم تھیں۔ اس اختلاف کے نتیجے میں ایک طرف تو علماء و مفسرین متنازعہ بنا دیے گئے دوسری طرف علوم جدیدہ کی تحصیل کے حوالے سے بھی شکوک وشبہات نے جنم لیا۔

طفیل احمد منگلوری کی مخالفت دراصل سرسید کی ''کانگرس مخالفت'' کی وجہ سے تھی۔ جس نے بعد میں مذہبی عقائد کی مخالفت کو جنم دیا۔ اس حوالے سے سید طفیل احمد منگلوری رقم طراز ہیں:

> ''..... بدقسمتی سے مذہبی امور میں تجاوز کرنے سے ان کی مخالفت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ علما اور مشائخ کے ساتھ کشاکش میں دونوں طرف دماغی توازن باقی نہ رہا اور سرسید نے اس زمانہ کے علما سے گزر کر تمام قدیم مفسرین کی روایات کو لغو اور بیہودہ قرار دیا اور انھیں علمائے یہود کا نہ صرف مقلد بلکہ اُن سے ایک قدم آگے بڑھا ہوا بتایا...... اس کشاکش نے ایک ایسا لٹریچر پیدا کر دیا تھا جو دونوں کے لیے شرمناک تھا۔ اس سے بظاہر فریقین کو اور دراصل کل قوم کو نہایت نقصان پہنچا۔ علما کے

اعتراضات سے سرسید کی تعلیمی تحریک عام مسلمانوں کے نزدیک مشتبہ ہو
گئی اور سرسید کے اعتراضات سے علمائے متقدمین اور متاخرین کی وقعت
سرسید کے متبعین کے دلوں سے اُٹھ گئی۔ مسلمانوں کا ماضی ان کی نظروں
میں تاریک ہو گیا۔ ان امور سے علمائے دین کا اثر قوم پر سے اٹھ گیا اور
حکام وقت کو مسلمانوں کی کل جماعت سے اندیشہ کی کوئی بات باقی نہ رہی
جس کی انھیں عرصہ دراز سے تمنا تھی۔ یہ حالت پیدا ہو جانے کے بعد سر
سید کی تعلیمی تحریک نے مجوزہ مدرستہ العلوم کی شکل اختیار کر لی۔''[۳۸]

ڈاکٹر سید عابد حسین عابد نے سرسید احمد خاں کی تعلیمی پالیسی کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایم اے او کالج جو ۱۸۷۷ء میں قائم ہوا اور ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی کے درجہ کو پہنچا وہ ہر حوالے سے سرسید کی منشا کے برعکس تھا۔ سرسید احمد خاں اپنے قائم کردہ اس ادارے میں چار قسم کے تعلیم یافتہ افراد پیدا کرنا چاہتے تھے:

① وہ جو انگریزی تعلیم حاصل کر کے سرکاری عہدے اور عزت و رفعت پائیں
② وہ جو انگریزی تعلیم حاصل کر کے جدید مغربی علوم کو اردو میں ترجمہ کریں
③ وہ جو اردو کی تعلیم حاصل کریں تا کہ ان کے لیے ترقی کے مواقع موجود ہوں
④ وہ جو عربی اور فارسی میں کمال حاصل کریں تا کہ مسلمانوں کے قدیم علوم کو آئندہ نسلوں تک پہنچا سکیں۔

سرسید مسلمانوں کو جدید علوم سے آراستہ کرنا چاہتے تھے۔ مگر ٹرسٹیوں کے پیش نظر صرف انگریزی تعلیم کا حصول تھا تا کہ ملازمتیں حاصل کی جا سکیں اسی لیے علی گڑھ اسی نہج پر چل پڑا۔ یہاں کھاتے پیتے گھرانوں کے لڑکے حسب ضرورت انگریزی تعلیم حاصل کرتے اور ملازمت حاصل کر لیتے۔ مزید یہ کہ یہاں ساری توجہ اس بات پر تھی کہ کس طرح انگریزی حکومت کی خوشنودی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں:

''.......علی گڑھ اسی طبقے کے لوگوں کی آرزوؤں اور حوصلوں کا آئینہ بن
گیا۔ اس میں خوش حال خاندانوں کے لڑکے بہ قدر ضرورت جدید تعلیم
حاصل کرتے تھے لیکن زیادہ زور ایسے وضع و لباس، اخلاق و آداب،

کھیلوں اور ورزشوں پر دیا جاتا تھا جن کے ذریعے انگریز حاکموں کو خوشنودی اور قربت حاصل ہو سکے۔''[۳۹]

مولانا عبیداللہ سندھی نے ان مؤرخین کو اپنی تحریروں میں آڑے ہاتھوں لیا جنھوں نے جنگ آزادی میں مسلمانوں کی قربانیوں کو تاریخ کا حصہ نہیں سمجھا، جنھوں نے برصغیر کی آزادی اور انگریزی حکومت کے خلاف مزاحمت کرنے والے حریت پسندوں کو نظر انداز کیا، جنھوں نے محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، شیخ الہند مولانا محمود حسن جیسی شخصیات کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا۔ جنھوں نے تحریک خلافت کے کردار کو نظر انداز کیا اور انگریزی حکومت کے خلاف ڈٹ جانے والے بہادروں کی بہادری کا بھی اعتراف نہیں کیا۔ وہ ان مورخین سے سوال کرتے ہیں کہ کیا انھیں اِن لوگوں کی قربانیاں نظر نہیں آتیں۔ کیا مولانا قاسم نانوتوی نے دیوبند میں بیٹھ کر قدیم اسلامی علوم کے چراغ روشن نہیں کیے اور کیا ہندوستان کی تاریخ میں صرف سرسید ہی ایک شخص گزرا ہے جس نے یہاں کے لوگوں کی خدمت کی۔ کیا علی گڑھ کالج ہی تھا، کیا اس کے سوا اور کوئی ادارہ نہ تھا جس نے مسلمانوں کو علم کی روشنی عطا کی ہو۔ وہ ایسے مؤرخین کو صاف لفظوں میں کہتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ انگریز سے سنایا جو انگریز نے لکھنے کا حکم دیا لکھ دیا۔ انھیں ایسا جھوٹ لکھتے ہوئے شرم آنی چاہیے تھی۔ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ ایسے مسلمانوں سے بھری ہوئی ہے جنھوں نے شکست کھا کر حوصلہ نہ ہارا اور انگریزوں سے لڑتے رہے اور تہذیبی و فکری حوالے سے قوم کا دفاع کیا اور تہذیبی و فکری میدان میں ہتھیار نہیں ڈالے۔ ملتِ اسلامیہ کی اس تاریخ کی طرف بھی مؤرخین کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے زبردست شہنشاہیت کے خلاف ہندوستانی مسلمان اٹھتے ہیں، یہ کتنی بڑی ہمت و جرأت کا کارنامہ ہے اور اس میں ہمارے عوام نے کیا کیا قربانیاں نہیں دیں!...... دھوکا باز بعض مؤرخین کی نظر میں یہاں نہ شاہ ولی اللہ ہوئے نہ شاہ عبدالعزیز، نہ یہاں سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید نے جہاد کیا۔ اور ہاں، دارالعلوم دیوبند قسم کی بھی ہندوستان میں کوئی چیز نہ تھی، مولانا قاسم کا بھی یہاں وجود نہ تھا، بس سرسید احمد خاں تھا اور ان کا کالج! خدا کا خوف کرو، جھوٹ کی بھی کوئی حد

ہوتی ہے۔ جو کچھ انگریز نے کہا وہ مان لیا اور لگے قوم کی تاریخ لکھنے!... خدا
سے ڈرو۔ ہندوستانی مسلمان کی سیاست صرف انگریز کی وفاداری ہی نہیں
رہی، وہ شکست کھا کر بھی انگریز سے لڑتا رہا ہے، تھوڑے بہت اسلحہ سے بھی
لیکن فکری، تہذیبی اور جماعتی جنگ اس نے برابر جاری رکھی اور انگریز کے
سامنے اس نے کبھی ہتھیار نہیں ڈالے۔ آخر ملت کی یہ بھی تاریخ ہے، اسے
تم کیوں بھول گئے؟ یہ دھوکہ کب تک چلے گا۔''[۴۰]

سرسید شناسی کی روایت کے دیگر رجحانات

اردو میں سرسید شناسی کی روایت مختلف رجحانات کی حامل رہی ہے۔ سرسید کی حمایت کرنے والے اور سرسید سے مخالفت کرنے والے۔ حمایت کے پیش نظر مختلف بنیادیں کارفرما ہیں جن میں ادب، مذہب، اصلاح، قوم، تاریخ اور عقیدت شامل ہیں۔ حالی کا نام، اگر سرسید کے اولین معتقدین اور مداحوں میں لیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

سرسید کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حمایت کا رجحان، آل احمد سرور، رام بابو سکسینہ، حامد حسن قادری، ابواللیث صدیقی اور سید احتشام حسین کے ہاں غالب نظر آتا ہے۔ ابواللیث صدیقی نے سرسید کو جدید اردو ادب کا بانی قرار دیا۔ حامد حسن قادری اور رام بابو سکسینہ نے اردو نثر کے اسلوب پر سرسید کے اسلوب کے اثرات کو اہمیت دی ہے اور اس کی مکمل دستگاہ قرار دیا ہے۔ آل احمد سرور کی تحریروں میں سرسید سے والہانہ محبت، ان کی رجحان پرستی کو ظاہر ہوتی ہے۔ اپنے ایک مضمون ''تہذیب اور ادب میں سرسید کا کارنامہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''ان [سرسید] کا اس [زبان] سے بڑا کارنامہ اسلوب کی دنیا میں ہے
> جسے انھوں نے محض پینترے یا زیور یا صنائی یا کاریگری ہونے سے بچا لیا
> اور معنویت، وزن اور وقار عطا کر کے پر مغز، دل کشا، اور دل آسا بنایا۔''[۴۱]

محمد امین زبیری نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے کہ علی گڑھ کالج کے طلبہ میں انگریزی حکومت کی وفاداری مسلم تھی۔ یہاں کے طلبہ قابلیت کے اعتبار سے انگلستان کے اداروں کے برابر تھے۔ بڑے بڑے انگریز افسران، وائسراؤں اور ضلعی حکام نے کالج کو بڑے بڑے فائدے

پہنچائے اور یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ کو سرکاری ملازمتوں میں دوسرے طلبہ پر ترجیح دی گئی۔اسی ادارے نے کانگریس کا زور شور کم کرنے اور مسلمانوں کو کانگریس کے اثرات سے بچانے کے لیے بھی کام کیا۔اسی ادارے نے مسلمانوں کے دامن سے غداری کے داغ دھوئے اور ان کے اندر سے تعصب اور جہالت کو دور کیا۔اس کے ساتھ ساتھ اسی کالج نے انگریزی حکومت کو یہ یقین دلایا کہ مسلمان ان کے دشمن نہیں بلکہ وفادار ہیں۔انگریزی حکومت نے بھی اس بات کا اعتراف کیا کہ یہاں کے طلبہ اور وابستگان علی گڑھ انگریزی حکومت کے وفادار اور خیر خواہ ہیں۔

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری نے سرسید احمد خاں کی شخصیت اور ان کے افکار کو کئی حوالوں سے سراہا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ سرسید احمد خاں ہندوستان میں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے مشترکہ قومیت کا نظریہ پیش کیا۔ان کا ایک اور اہم کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے علی گڑھ میں مسلمانوں کے لیے جدید تعلیم کا بندوبست کیا اور ان لوگوں میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، مولانا طفیل احمد منگلوری، رفیع احمد قدوائی، میر اکبر علی خاں، ڈاکٹر ذاکر حسین، شیخ محمد عبداللہ، ڈاکٹر سید محمود خاں، محمد عبدالغفار جیسے نامور لوگ شامل ہیں۔

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری نے جہاں سرسید احمد خاں کے خیالات و نظریات اور ان کی تعلیمی کوششوں کی تعریف کی ہے وہاں انھوں نے اس بات پر حیرت و استعجاب کا بھی اظہار کیا ہے کہ سرسید احمد خاں نے تعلیم نسواں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی بلکہ وہ تعلیم نسواں کے شدید ترین مخالف تھے۔سرسید کا خیال تھا کہ مردوں کو تعلیم دینے سے عورتیں خود بخود تعلیم یافتہ ہو جائیں گی اس لیے انھوں نے ہر ایسے اقدام کی مخالفت کی جن کا مقصد عورتوں کی تعلیم کو فروغ دینا تھا۔مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے کئی اجلاس ایسے تھے جن میں تعلیم نسواں کی تجاویز پیش کی گئیں مگر سرسید نے ہمیشہ ایسی تجاویز کی مخالفت کی۔ان کا کہنا تھا کہ خواتین کو تعلیم دلانا ان کے ساتھ ظلم کرنے کے مترادف ہے۔ان کو قرآن پڑھا دینا اور عربی، فارسی کی ابتدائی تعلیم دے دینا کافی ہے۔عام مسلمان اور سرسید کے رفقا اس حوالے سے سرسید سے اختلاف رکھتے تھے مگر سرسید اپنے نظریات پر آخر تک قائم رہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری رقم طراز ہیں:

> ''یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ سرسید تعلیم نسواں کے مخالف تھے۔۔۔
> مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں متعدد بار خواتین میں تعلیم کو عام

کرنے کے سلسلہ میں تجاویز پیش کی گئیں مگر سرسید نے ان میں سے ہر ایک کی مخالفت کی .... صرف اتنا ہی نہیں بلکہ تعلیم نسواں کی مخالفت کے جوش میں وہ یہاں تک کہہ گئے کہ خواتین کو تعلیم دلانا ان کے ساتھ سخت ظلم کرنا ہے....... سرسید خواتین کے لیے اُسی قدیم طرز کی تعلیم کے حق میں تھے جس میں قرآن شریف پڑھا دیا جاتا تھا، دینی مسائل سے متعلق ابتدائی کتابوں کی تعلیم دے دی جاتی تھی اور ضرورت کے مطابق اردو فارسی پڑھادی جاتی تھی، اسی سے ان کی اخلاقی تربیت ہوتی تھی اور اسی کے ذریعہ وہ اپنے حقوق وفرائض پہچان جاتی تھیں۔ سرسید کے ان خیالات سے عام طور پر لوگ متفق نہیں تھے، خود اُن کے رفقا بھی اس مسئلہ پر اختلاف رکھتے تھے۔" [۴۲]

سرسید کو بطور مورخ سراہنے والوں میں خلیق انجم کا نام سرفہرست ہے۔ تاریخ محض ماضی پرستی نہیں ہے بلکہ یہ سماجی، تہذیبی، معاشرتی اور تمدنی تغیرات کا نام ہے۔ خلیق انجم نے بھی سر سید کو بطور مورخ ماضی پرست نہیں بلکہ مستقبل کے نباض کے طور پر پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ماضی سے ہمارا رشتہ مثبت بھی ہوتا ہے اور منفی بھی۔ اپنے روشن ماضی کو یاد کرنا، ماضی کے چراغوں سے حال کے چراغ روشن کرنا اور مستقبل کے لیے راستہ تلاش کرنا ہرگز قدامت پسندی یا ماضی پرستی نہیں ہے اور اگر ایسا ہے تو علامہ اقبال کو کس خانے میں رکھیں گے۔ مسلمانوں کی عظمت پارینہ کے سب سے زیادہ گیت انھوں نے ہی گائے ہیں۔ اگر سرسید اور اقبال ماضی پرست ہو کر بے علمی، مایوسی اور احساس ناکامی کا شکار ہو جاتے تو یقیناً قدامت پرست اور ماضی پرست کہلاتے اور ماضی سے ان کا رشتہ منفی کہلاتا، لیکن ایسا نہیں ہے۔ ان دونوں نے ماضی سے روشنی لے کر مستقبل کی راہوں کی نشاندہی کی ہے۔" [۴۳]

خیال امروہوی نے سرسید کو مارکسزم اور سوشلزم کا داعی قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ہر معقول طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ مارکس یا لینن کے اس

قول پر جذباتی بحث نہ کرے کہ ''مذہب افیون ہے۔'' بلکہ سرسید کے مقالات کا مطالعہ کرے۔[۴۴]

کچھ مداحوں نے سرسید کی حمایت میں کہ وہ عقیدت کا جام جم تھام کر مبالغہ آمیز اُسلوب بھی اختیار کیا ہے۔ان مداحوں میں مولانا غلام رسول مہر اور صلاح الدین محمود کا نام شامل ہے۔صلاح الدین محمود نے سرسید کی محبت وعقیدت سے سرشار ہو کر رواں اور دل آویز اسلوب میں لمحے کی داستان میں لکھا ہے:

''سرسید احمد خاں اب ہمارے خون کے شعور کا ایک حصہ ہیں۔اللہ کا رنگ لیے صدیوں سے رواں، ہمارے اس خون نے، ان کے وقتوں میں، ان کی بھی بات سنی ہے اور چاشنی پائی ہے۔ایک روز وہ ہمارے دل میں آئے اور خون کو کچھ اپنا رنگ دیا، پھر دھیرے دھیرے انھوں نے ہمارے دماغ کے چند ایسے حصوں کو، جو کہ تاریک ہو گئے تھے، دوبارہ روشنی دی، آج ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ہمارے دماغ کے ان روشن ایوانوں میں گشت کرتے ہیں۔اب یہ ہمیشہ واسطے ہمارا خون ان کا ہم راز ہے۔''[۴۵]

ڈاکٹر ظفر حسن ایک تاجر ہیں۔انھوں نے ٹیکسٹائل ٹیکنالوجی میں بی ایس سی، امریکہ سے کی۔کراچی یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا اور اردو میں سندھ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی نگرانی میں حاصل کی۔ان کے پی ایچ۔ڈی کے مقالے کا عنوان ''سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت'' ہے۔یہ اس موضوع پر منفرد مقالہ ہے جو سرسید شناسی کے گوشے، نظریہ فطرت اور سرسید کے انداز فکر کو اجاگر کرتا ہے۔

ڈاکٹر ظفر حسن نے سرسید کی شخصیت اور تحریروں میں نظریہ فطرت کی کارگزاری اور تضادات کا تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر ظفر حسن کے سرسید کے نظریہ فطرت کا تجزیہ ذیلی نکات کی تقسیم سے کیا جاسکتا ہے:

① برصغیر میں مغربی افکار (تصور فطرت) کی مقبولیت کے محرکات
② سرسید کا نظریہ فطرت
③ تفسیر، فقہ، معاشرے اور ادب میں نظریہ فطرت کا استعمال

④ سرسید کے نظریہ فطرت کے اثرات
⑤ سرسید کے تصور فطرت کے تسامح کے اسباب

ڈاکٹر ظفر حسن لکھتے ہیں:

''سرسید، انگریزوں کی سیاسی اور صنعتی طاقت سے اتنے مرعوب ہوگئے کہ مغربی فلسفہ اور ادب تو الگ رہا، انھیں انگریزوں کے کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے کے طریقے تک مسلمانوں سے بہتر معلوم ہونے لگے اور اپنے طور طریقے انھیں گھٹیا نظر آنے لگے۔ اس میں انھیں اتنا غلو ہوا کہ وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ جب تک مسلمان انگریزوں کا طریقہ فکر اور انھیں کے رسم ورواج اختیار نہیں کریں گے دنیاوی ترقی نہیں کر سکتے۔ اب انھوں نے مسلمانوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ سائنس اور متعلقہ فنون کی تعلیم کے حصول سے بھی زیادہ انھوں نے اس بات کی کاوش کی کہ مسلمان مغربی انداز فکر اختیار کریں۔''[۴۶]

اکیسویں صدی کے آغاز میں سرسید شناسی کی روایت کا ایک اہم کارنامہ ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی تصنیف سر سید احمد خاں اور جدت پسندی ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس مارکسی نقاد نے سرسید کے ساتھ ساتھ موجودہ عہد میں سرسید کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کو بھی موضوعِ بحث بنایا ہے۔ اس تصنیف کی وجہِ تخلیق کا تذکرہ وہ دیباچے میں یوں کرتے ہیں:

''ایک عمر تک سرسید احمد خاں کی فکر پر ہونے والی بحث وتمحیص سے اُلجھتے رہنے کے بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ سرسید احمد خان سے اختلافات کی ایک وجہ اُن کی زندگی اور فکر کی بعض اہم تفصیلات سے چشم پوشی بھی ہوسکتی ہے۔ اس لیے میں نے اپنی کاوش میں بعض ایسے گوشوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے جن سے سر سید احمد خاں کی زندگی کے بارے میں زیادہ معروضی انداز میں غور کرنے میں مدد ملے گی۔ زیادہ حد تک نہ سہی تو کسی حد تک ہی سہی۔''[۴۷]

صدیقی صاحب نے سرسید کے افکار کا جامع، فکری، اور مفسر انداز میں تجزیہ کیا ہے سرسید کی مخالفت کے مضمرات میں اول حیثیت کانگریس کی مخالفت کو حاصل ہے۔ جس کے باعث

علمائے دیوبند سرسید کے مخالف ہو گئے۔ انھی علماء کی مخالفت کی دوسری وجہ سرسید کا عثمانی خلیفہ کو روحانی سربراہ ماننے سے انکار تھا۔ اس مخالفت پر تنقیدی خیالات کی روشنی بھی ملتی ہے کہ سرسید، ترکی اور برصغیر کے مابین صفاتی فرق کو سمجھتے تھے کہ ترکی ایک وسیع وعریض آزاد سلطنت ہے اور ہندوستان ایک غلام ملک ہے اور تیسری وجہ، سرسید ان مخالفتوں کا سامنا کرنے کے ساتھ انگریزوں کے اعتماد کے حصول کے خواہاں بھی تھے اور سرسید دو مختلف محاذوں پر بیک وقت برسرِ پیکار تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''سرسید احمد خاں کے ذمہ دوہری ذمہ داری تھی۔ ایک طرف کنوئیں میں ڈوبی ہوئی قوم کو بھرپور طاقت سے باہر نکالنا اور پھر اس کے دماغ سے فرسودہ دنیاوی علوم کے ان ''جالوں'' کو صاف کرنا جن کے رہتے ہوئے یہ قوم ''کنوئیں سے نکل کر کھائی'' میں گر سکتی تھی۔''[۴۸]

سرسید احمد خاں نے **تہذیب الاخلاق** کے ذریعہ بھی مسلمانانِ ہند کی اصلاح کی کوشش کی انھوں نے مسلمانوں کو نہ صرف زمانے کی ضرورت سے آگاہ کیا بلکہ تہذیب وشائستگی بھی سکھائی اور دین بھی اس انداز میں سمجھایا کہ جو عقل وفہم کے مطابق ہو۔ اس حوالے سے محمد اکرام چغتائی رقم طراز ہیں:

> ''تہذیب الاخلاق'' نے ہمیں بہت کچھ سکھایا۔ اس نے نہ صرف لکھنا پڑھنا سکھایا بلکہ سوچنا اور محسوس کرنا بھی سکھایا اس نے نہ صرف زندہ رہنے کا گُر سکھایا بلکہ تہذیب وشائستگی سے زندہ رہنے کا گُر بتایا۔ اس نے ہم میں صرف دنیاداری ہی نہیں بلکہ ایک قابل فہم دین داری بھی، یعنی وہ دین داری جو سمجھ میں آسکے اور سمجھائی جا سکے! بلکہ وہ دین داری بھی جو افراد کی ذاتی نجات اور ضمیر ودل کی صحت مندی کا وسیلہ بھی ہو اور سماج کی خوش حالی اور راحت کا ذریعہ بھی بن سکے۔ ظاہر ہے کہ ''تہذیب الاخلاق'' کے یہ سب کارنامے زمانے کے بڑے کارناموں میں شمار کیے جا سکتے ہیں!''[۴۹]

سرسید احمد خاں نے مسلمانانِ ہند کے دورِ ابتلا میں مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ انھوں نے انگریزی حکومت سے تعلقات استوار کیے تاکہ مسلمانوں اور انگریزی حکومت کے درمیان پائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کیا جا سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے مسلم نوجوانوں کو جدید مغربی

علوم سے بھی روشناس کرایا تاکہ وہ سرکاری ملازمتیں حاصل کر سکیں اور معاشرے میں عزت اور وقار حاصل کر سکیں ورنہ ہندو تمام اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو رہے تھے اور مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان فاصلے بڑھتے جا رہے تھے۔ سرسید احمد خاں نے مسلمانوں اور انگریزی حکومت کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے۔

سرسید احمد خاں نے جدید مغربی علوم باقاعدہ حاصل نہ کیے تھے اور اسی طرح وہ دینی علوم کے بھی ماہر نہ تھے اس لیے جب انھوں نے مذہبی افکار و نظریات کا جدید علوم کی روشنی میں جائزہ لینا شروع کیا تو ان سے کئی غلطیاں سرزد ہوئیں۔ ان کے نظریات کے حوالے سے جب مخالفت کا آغاز ہوا تو وہ بھی خم ٹھونک کر میدان میں آ گئے اور پھر اپنے نظریات کا دفاع کرتے کرتے بہت سی ایسی باتیں بھی کر گئے جو اسلام کے بنیادی نظریات سے متصادم تھیں۔

سرسید احمد خاں کے مذہبی نظریات بہت سے حوالوں سے درست نہ تھے۔ انھوں نے آیاتِ قرآنی کی تفسیر بھی انھی نظریات کی روشنی میں لکھنے کی کوشش کی جو محلِ نظر ہیں۔

سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی دنیاوی ترقی کے لیے خلوص نیت سے کام کیا۔ اس حوالے سے ان کی نیت پر شک کرنا درست نہیں مگر ان کے مذہبی نظریات کو ہمیشہ شکوک و شبہات کی نظر سے دیکھا گیا۔ انھوں نے اردو زبان کی بقا اور اس کے فروغ کے لیے بھی بہت کام کیا۔ خصوصاً اردو نثر ان کے احسانات سے گراں بار ہے۔ ان کے احسانات اہلِ ہند پر بے شمار ہیں۔ مگر ان پر یہ بھی اعتراض ہے کہ انھوں نے مسلمانانِ ہند کو انگریز کی تقلید بلکہ غلامی کا راستہ دکھایا بلکہ اس کی تبلیغ بھی کی۔

برصغیر پاک و ہند سے تعلق رکھنے والے بہت سے اہلِ قلم نے سرسید کی شخصیت اور ان کے افکار کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ضیاء الدین لاہوری کا تحقیقی کام بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ انھوں نے عمر بھر سرسید احمد خاں کی شخصیت اور ان کے افکار و نظریات پر کام کیا اور سرسید احمد خاں کی شخصیت کو ان کے اپنے افکار کی روشنی میں اردو ادب کے قارئین کے سامنے پیش کیا۔ اِس مقالے کے آئندہ ابواب میں ضیاء الدین لاہوری کے سرسید کے حوالے سے کیے گئے تحقیقی کام کا جائزہ لیا جائے گا۔

حوالہ جات

۱۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، لاہور، گلوب پبلیشرز: ۱۹۸۶ء ص ۴۷۳
۲۔ الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، کانپور، نامی پریس: ۱۹۰۱ء، ص ۱
۳۔ ایضاً، ص ۵۲۲
۴۔ الطاف حسین حالی، مقالات حالی جلد اوّل، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، س ن، ص ۲۲۵
۵۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مشمولہ، روئیداد صدسالہ برسی علامہ شبلیؒ کانفرنس، لاہور، گورنمنٹ پنجاب پبلک لائبریری: 2015، ص ۲۵
۶۔ علامہ شبلی نعمانی، بحوالہ سر سید تحریک کا ردعمل (ڈاکٹر صدیقہ ارمان) کراچی، علی گڑھ مسلم اولڈ بوائز ایسوی ایشن: ۱۹۹۹ء، ص ۱۰۷
۷۔ وقار الملک نواب، بحوالہ، سیلیکٹڈ ڈاکومنٹس فرام دی علی گڑھ آرکائیوز، (مرتبہ یوسف حسن) علی گڑھ، یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۶ء، ص ۱۸۵
۸۔ نواب محسن الملک، تحریر فی اصول التفسیر، سرسید احمد خاں، آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۸۹۲ء، ص ۲۲
۹۔ مولوی نذیر احمد، موعظہ حسنہ، دہلی، مطبع انصاری: ۱۳۰۸ھ ص ۱۷۵
۱۰۔ سید امداد العلی، امداد الآفاق (بحوالہ سرسید احمد خاں، سیاسی مطالعہ از عتیق صدیقی) مکتبہ جامعہ نئی دہلی: ۱۹۷۷ء، ص ۱۳۹
۱۱۔ صفدر سلیمی، پاکستان کا معمارِ اوّل، لاہور، اِدارہ طلوع اسلام: ۱۹۶۷ء، ص ۱۷
۱۲۔ عبدالحق حقانی، تفسیر حقانی (جلد دوم) دہلی، دار الاشاعت: ۱۳۵۷ھ، ص ۱۲۷
۱۳۔ ایضاً، ص ۱۱۴

۱۴۔ احمد ندیم قاسمی، تہذیب و فن ،لاہور، پاکستان بُک اینڈ لیٹریری ساؤنڈز: س ن، ص ۱۳۷

۱۵۔ علی بخش خاں، شہاب ثاقب لکھنؤ، مطبع نول کشور: س ن، ص، ۶۹۔۶۸

۱۶۔ محمد قاسم نانوتوی، تصفیته العقائد، کراچی، دارالاشاعت: ۱۹۷۶ء، ص، ۹۔۸

۱۷۔ ناصر علی دہلوی میر، کراچی، مقاماتِ ناصری، انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۶۹ء، ص ۱۳۳

۱۸۔ مولانا ابوالکلام آزاد، آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، (عبدالرزاق ملیح آبادی) لاہور: مطبوعاتِ چٹان ۱۹۶۲ء، ص ۳۶۸

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۷۷

۲۰۔ پروفیسر اصغر عباس، سر سید، اقبال اور علی گڑھ ،علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۶ء، ص ۶۴

۲۱۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری دیباچہ ، سر سید کی کہانی ان کی اپنی زبانی، مرتبہ ضیاءالدین لاہوری، لاہور، جمعیۃ پبلیکیشنز: ۲۰۰۵ء، ص ۲۳

۲۲۔ ایضاً، ص ۳۳، ۳۲

۲۳۔ اصغر علی روحی، مافی الاسلام جلد اول، لاہور، منظور عالم پریس: ۱۹۳۱ء، ص ۲۔۳۷۲۔۳۷۱

۲۴۔ ڈاکٹر اے۔ ایچ۔ کوثر، اردو کی علمی ترقی میں سر سید اور ان کے رفقا کا حصه، کراچی، لائبریری پروموشن بیورو: ۱۹۸۴ء، ص ۱۹۹

۲۵۔ پروفیسر ثریا حسین، سر سید احمد خاں اور ان کا عهد، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس: ۱۹۹۳ء، ص ۵۷

۲۶۔ خلیق احمد نظامی، علی گڑھ کی علمی خدمات، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو: ۱۹۹۴ء، ص ۲۰۔

۲۷۔ خلیق احمد نظامی، مضمون سہ ماہی معارف ،اعظم گڑھ: جولائی ۱۹۸۹ء، ص، ۲۷۔۲۶

۲۸۔ ذاکر حسین، ڈاکٹر، ذاکر صاحب اپنے آئینه لفظ و معنی میں (ضیاءالحسن فاروقی) دہلی، جامعہ ملیہ اسلامیہ: ۱۹۸۷ء، ص ۷۷

۲۹۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی، اکبر الہ آبادی کے خیالات، نگار، اکبر الہ آبادی نمبر، کراچی: ۱۹۴۹ء،ص ۳۰
۳۰۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ترجمان القرآن، لاہور: مئی ۱۹۹۴ء،ص ۳۶
۳۱۔ ریاض الرحمٰن شروانی، کانفرنس گزٹ علی گڑھ، اکتوبر ۲۰۰۵ء،ص ۱۴
۳۲۔ زاہد چودھری، روشن خیال **سر سید احمد خاں** ، لاہور، ادارہ مطالعہ تاریخ: ۱۹۹۹ء ص ۲۳۷۔۲۳۶
۳۳۔ پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی، سرسید احمد خان، نگار، سرسید نمبر ۲، کراچی: ۱۹۷۱ء،ص ۱۶۰،
۳۴۔ ایضاً، ص ۱۶۱
۳۵۔ مولوی عبدالحق، سر سید احمد خاں، حالات و افکار، کراچی، انجمن ترقی اردو: ۱۹۵۰ء،ص ۷۶۔
۳۶۔ ضیاء الحسن فاروقی، اسلام اور عصر جدید، نئی دہلی: جنوری ۱۹۹۵ء،ص ۱۳۔۱۲
۳۷۔ طفیل احمد سید منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل ، دہلی، مکتبہ جامعہ: ۱۹۴۰ء ص ۱۹۲
۳۸۔ ایضاً، ص ۱۹۸
۳۹۔ ڈاکٹر سید عابد حسین، سرسید احمد خان، مشمولہ نگار، سرسید نمبر ۲، کراچی: ص ۱۷۹
۴۰۔ مولانا عبیداللہ سندھی، افادات و ملفوظات ، (مرتب، پروفیسر محمد سرور) لاہور، سندھ ساگر اکیڈمی: ۱۹۸۴ء،ص ۶۸
۴۱۔ آل احمد سرور: ''تہذیب اور ادب میں سرسید کا کارنامہ'' مشمولہ انتخاب آل احمد سرور، مرتبہ فقیر احمد فیصل، لاہور: لاہور اکیڈمی، س ن، ص ۶۴، ۶۳
۴۲۔ ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری، مولانا آزاد سر سید اور علی گڑھ، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند: ۱۹۹۲ء،ص ۴۴
۴۳۔ خلیق انجم ''سرسید بحیثیت مورخ''، **تہذیب**، کراچی: سرسید نمبر، مارچ ۱۹۹۸ء،ص ۸۵
۴۴۔ خیال امروہوی ''سرسید احمد خاں''، مشمولہ سپوتنک، لاہور: جنوری ۱۹۹۵ء،ص ۴۰
۴۵۔ صلاح الدین محمود "سر سید احمد خاں، لمحے کی داستاں'' تہذیب

کراچی: سرسید نمبر، مارچ ۱۹۹۸ء، ص ۱۱۱

۴۶۔ ڈاکٹر ظفر حسن، سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت ، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور: طبع اول ۱۹۹۰ء، ص ۱۱۱

۴۷۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، دیباچہ، **سر سید احمد خاں اور جدت پسندی** ، کراچی، ارتقا مطبوعات: ۲۰۰۲ء، ص ۵

۴۸۔ ایضاً، ص ۲۰

۴۹۔ محمد اکرام چغتائی، مطالعہ سر سید، لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز ۲۰۰۶ء، ص ۱۴۶

باب دوم

سرسید شناسی

مغالطے اور مبالغے

سرسید احمد خاں برصغیر پاک و ہند کی معروف ترین شخصیات میں شامل ہیں۔ انھوں نے اپنی سحر انگیز شخصیت اور اپنے افکار سے انیسویں اور بیسویں صدی کے ہندوستان کو بہت متاثر کیا۔ انھوں نے اپنی تصانیف **سرکشی ضلع بجنور** اور رسالہ **اسباب بغاوت ہند** لکھ کر ایک طرف تو انگریزی حکومت کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہونے کی وجہ انگریزی حکومت کی بعض پالیسیاں تھیں جبکہ دوسری طرف مسلمانوں کو بھی یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ ماضی کو بھول کر موجودہ حالات سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کریں اور انگریزی حکومت سے تعاون کریں۔ انھوں نے مسلمانانِ ہند اور انگریزی حکومت کے مابین فاصلوں کو کم کرنے کی سنجیدہ کوشش کی۔ انھوں نے مسلمانانِ ہند کو جدید تعلیم دینے کے لیے علی گڑھ میں سکول و کالج کی بنیاد رکھی تاکہ مسلمانان ہند بھی تقاضائے وقت کو سمجھیں اور وہ تعلیم حاصل کریں۔ انھوں نے اپنے رسالے **تہذیب الاخلاق** کے ذریعے بھی مسلمانوں کی تہذیبی و معاشرتی ترقی اور بہتری کے لیے کام کیا اور مسلمانوں کو جدید دور کے تقاضوں کو سمجھنے اور ان کا ساتھ دینے اور زمانے کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلنے کے قابل بنایا۔

سرسید احمد خاں نے اپنے شہر دلی کی تباہی اور بربادی کو نہ صرف دیکھا بلکہ اس تباہی اور بربادی پر وہ باقی مسلمانوں کی طرح غم و الم میں ڈوبے رہے مگر بہت جلد انھوں نے اصلاح احوال کا فیصلہ کیا۔ ان کی دور اندیش نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ ہندوستانی حکمرانوں کے اندر اتنی سکت نہیں کہ وہ اقتدار دوبارہ حاصل کر لیں لہٰذا نئی انگریزی حکومت سے تعاون مجبوری بھی ہے اور تقاضائے

وقت بھی۔انھوں نے انگریزی حکومت سے تعاون کا فیصلہ کیا، انگریزی حکومت کا اعتماد حاصل کیا اور پھر مسلمانوں کی تہذیبی و معاشرتی، تعلیمی، سیاسی اور مذہبی اصلاح کے کام کا آغاز کیا۔

مسلمانانِ ہند کی اکثریت چونکہ نظریاتی طور پر انگریزوں اور انگریزی حکومت کی مخالف تھی اس لیے انگریزی حکومت سے سرسید کا تعاون مسلمانانِ ہند کو پسند نہ آیا۔مزید یہ کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران سرسید نے انگریزی حکومت کے ساتھ تعاون کیا اس وجہ سے مسلمانانِ ہند ان سے خائف ہو گئے اور انھیں اپنا خیر خواہ سمجھنے کی بجائے انگریزی حکومت کا خیر خواہ سمجھنے لگے۔ اس پر مستزاد یہ کہ خود سرسید نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا کہ وہ انگریزی حکومت کے خیر خواہ اور وفادار ہیں۔سرسید کے ان نظریات کی وجہ سے بہت جلد ان کے خلاف ردِّعمل بھی سامنے آیا لیکن ان کی مخالفت میں شدت اس وقت آئی جب سرسید کے مذہبی خیالات سامنے آئے۔

سرسید احمد خاں کی مخالفت میں جہاں بہت سے لوگ سامنے آئے اور ان کے سیاسی و مذہبی نظریات کی شدید مخالفت اور ان پر نکتہ چینی کی وہاں سرسید کو خیر خواہوں اور ہمدردوں کی صورت میں بھی ایک جماعت میسر آ گئی۔ یوں سرسید کی مخالفت اور حمایت میں لکھنے والے دونوں طرح کے صاحبانِ علم موجود تھے۔دونوں طرف کے نقطۂ ہائے نظر سے وابستہ افراد کی تعداد خاصی کثیر تھی اور ہے۔ایک گروہ تھا جو سرسید کے مذہبی نظریات کو تو تسلیم نہ کرتا تھا مگر ان کی اصلاحی کوششوں کا مداح بلکہ مدد و معاون تھا۔ یوں سرسید کی حمایت اور مخالفت میں خوب لکھا گیا۔دونوں حوالوں سے مبالغے سے بھی خوب کام لیا گیا۔

سرسید کی حمایت میں لکھنے والوں نے انھیں ایک مثالی پیکر بنا کر پیش کیا۔ایسا کرنے والے شاید یہ بات بھول گئے کہ سرسید بھی انسان تھے اور ان کی زندگی بھی نشیب فراز سے عبارت تھی۔

ضیاء الدین لاہوری کے بہ قول سرسید کے کردار کے دو رخ نظر آتے ہیں۔ یہ دونوں رخ ایک دوسرے سے قطعی مختلف بلکہ متضاد ہیں۔سرسید کے کردار کا ایک رخ تو وہ ہے جہاں انھیں ایک مثالی شخصیت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔سرسید ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی شکست سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، لہٰذا انھوں نے انگریزی حکومت کے ظلم و ستم سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے اپنا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔انھوں نے وقتی مصلحت کے تحت انگریزی حکومت سے تعاون کی حکمتِ عملی اختیار کی۔انھوں نے علی گڑھ میں کالج قائم کیا تا کہ مسلمانانِ ہند اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو کر

آزادی کی جنگ لڑنے کے قابل ہو سکیں۔ انھیں دوقومی نظریے کا موجد و بانی بھی قرار دیا گیا۔

ضیاء الدین لاہوری کے بقول سرسید کا اصل رنگ وروپ وہ ہے جو ان کی تحریروں، تقریروں، ان کے معاصرین کے بیانات، ان کے احباب کی تحریروں یا اس زمانے کے اخبارات، رسائل، سرکاری، رپورٹس اور مراسلات کے ذریعے سامنے آتا ہے یہ وہ مواد ہے جو سامنے نہیں لایا جاتا جس کے باعث سرسید کی اصل تصویر پر پردہ پڑا رہا اور حقائق ماضی کی گرد میں چھپے رہے۔ اس سلسلے میں ضیاء الدین لاہوری کہتے ہیں:

> ''ایک سرسید وہ ہے جسے میں نے اور آپ نے نصابی ضرورتوں کے تحت کتابوں میں پڑھا اور نصاب سے متاثرہ مضمون نگاروں کے تراشے ہوئے ایک عظیم بُت کے روپ میں اُسے ذرائع ابلاغ میں ملاحظہ کیا، دوسرا سرسید وہ ہے جو اپنی اور اپنے رفقائے کار کی مطبوعہ تحریروں، تقریروں، سرکاری رپورٹوں اور پچھلی صدی کے اخبارات ورسائل اور جرائد کی فائلوں میں مجسم بالذات پایا جاتا ہے مگر ہماری آنکھوں سے بوجوہ اوجھل رکھا جاتا ہے۔''[۱]

ضیاء الدین لاہوری نے ایک طویل عرصے تک تحقیق کر کے سرسید احمد خاں کی ذات، ان کی تحریروں، تقریروں، بیانات، خطبات اور متعلقہ مواد کو جمع کیا اور اس کا تجزیہ کیا۔ انھوں نے صلے کی تمنا سے بے پرواہو کر حقائق پر مبنی دلائل سے پر مقالات اور کتب لکھیں۔ اسی سلسلے میں انھیں مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا، اخبارات ورسائل نے ان کی تحریروں کی اشاعت سے انکار بھی کیا مگر وہ اپنے کام میں لگے رہے۔ برصغیر پاک وہند کے معروف اور غیر معروف علمی مراکز اور کتب خانوں کے علاوہ انھوں نے لندن میں موجود ریکارڈ سے بھی استفادہ کیا۔ انھوں نے سرسید کی تحریروں، تقریروں اور بیانات کی روشنی میں سرسید پر تحقیق کی۔ ضیاء الدین لاہوری اپنے طریقہ تحقیق سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''میں نے سچ ڈھونڈے کے لیے نہایت ہی نازک اور حساس موضوع کا انتخاب کیا تھا لہٰذا یہی مناسب سمجھا کہ میں کم از کم بولوں اور ایک محدود فاصلے پر کھڑا ہو کر سرسید، اُن کے بااعتماد رُفقا اور معروف ناقدین کی

تحریروں سے منتخب مواد آگے کیے جاؤں۔ حوالے خود بولیں اور قاری کسی بیرونی تجزیاتی دباؤ کے بغیر درست نتائج اخذ کر سکے۔ اس طرح اُن تعصّبات کی نفی ہو جو سرسید کے بعض اقوال وافعال کو ''اُس عہد کے معروضی حالات کے پس منظر میں وقت کا تقاضا'' قرار دینے والوں نے پیدا کر رکھے ہیں۔ نیز تفصیلی اقتباسات سے درست پس منظر کی نشاندہی ہو اور مبینہ ''معروضی حالات'' کی فرضی حقیقت کھل کر سامنے آئے۔''[۲]

سرسید اور علما کے اختلافات

سرسید احمد خاں کی ابتدائی تصانیف کو ہندوستان کے اہلِ علم نے قدر کی نگاہ سے دیکھا مگر ان کی جنگ آزادی کے حوالے سے آنے والی کتب اور رسائل نے بعض مسلمانوں کو سرسید سے برگشتہ کر دیا۔ مسلمانانِ ہند نے ان کی تصنیف تاریخ سرکشی بجنور اور رسالہ اسباب بغاوت ہند پر اعتراضات اٹھائے۔ بعدازاں ان کی دیگر تحریروں اور تصانیف کے ذریعے ان کے مذہبی خیالات سامنے آئے جس سے ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں بے چینی اور اضطراب پیدا ہوا۔ خصوصاً علمائے کرام نے سرسید کے ان نظریات کو ناپسند کیا اور ان کے خلاف بھرپور ردِعمل کا اظہار کیا، کیونکہ سرسید کے بعض مذہبی نظریات اسلام کے بنیادی عقائد سے متصادم تھے۔ سرسید کے خلاف کفر کے فتوے بھی دیے گئے۔ اس زمانے میں انھوں نے علی گڑھ کالج کے قیام کا منصوبہ بنایا۔ علی گڑھ کالج کے قیام کے بعد بھی سرسید کے نظریات کے حوالے سے اختلافات کا سلسلہ چلتا رہا، مگر آہستہ آہستہ علما کو سرسید کے مشن کی سمجھ آنے لگی اور ان کی مخالفت کم ہوتی گئی۔

علمائے کرام اور سرسید کی باہمی کشمکش اور اختلافات میں سرسید کے حامیوں نے ہندوستان کے لوگوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ علما جدید تعلیم کے خلاف ہیں۔ اس تاثر کو عام کرنے کے لیے مبالغے سے کام لیا گیا۔ سرسید حاکمانِ وقت سے میل جول رکھتے تھے اور سرکار کی نگاہ میں ان کی عزت تھی۔ علما نے سرسید کے ان مذہبی خیالات پر اعتراضات اٹھائے تھے جو انھوں نے تفسیر قرآن میں پیش کیے تھے۔ سرسید کے مذہبی خیالات پر یہ اعتراضات نہ صرف علما نے اٹھائے بلکہ سرسید کے قریبی ساتھی مولانا حالی بھی ان کے مذہبی خیالات سے متفق نہ تھے۔ مولانا

حالی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ اور تمام انبیا سابقین کے قصوں میں جس قدر واقعات بظاہر خلافِ قانونِ فطرت معلوم ہوتے ہیں جیسے یدِ بیضا، عصا کا اژدھا بن جانا، فرعون اور اس کے لشکر کا غرق ہونا، خدا کا موسیٰ سے کلام کرنا، پہاڑ پر تجلی کا ظاہر ہونا، ابر کا سایہ کرنا، من وسلویٰ کا اُترنا یا عیسیٰ کا گہوارہ میں بولنا، منطق طیر، اندھوں اور کوڑھیوں کو چنگا کرنا، مُردوں کو زندہ کرنا، مائدہ کا نزول وغیرہ وغیرہ، ان کی تفسیر میں جو کچھ سرسید نے لکھا ہے وہ غالباً پہلے کسی مفسر نے نہیں لکھا۔''[۳]

نواب محسن الملک بھی سرسید احمد خاں کے قریبی اور قابل اعتماد ساتھی تھے مگر سرسید کے مذہبی نظریات سے وہ بھی متفق نہ تھے۔ اس حوالے سے نواب محسن الملک لکھتے ہیں:

''یہ سچ ہے کہ ہمارے مسلمہ عقائد سے وہ اختلاف رکھتے تھے اور اس اختلاف کو انھوں نے شدومد کے ساتھ ظاہر بھی کر دیا جس کی وجہ سے تمام مسلمان اور اکثر علما کو اُن کے اسلام پر قائم رہنے میں شُبہ تھا اور بعض نے یہاں تک کہ کفر کے فتوے بھی دے دیے۔ اور اُن کو کیا کہوں، خود مجھ کو بہت سے مسائل میں ان سے اختلاف کرنا پڑا، بحث ومباحثے رہے۔''[۴]

سرسید کے مذہبی عقائد ونظریات کے حوالے سے اور بھی بہت سے صاحبانِ علم ودانش نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اس بات کی وضاحت کی کہ علما سرسید کے اس لیے مخالف نہ تھے کہ سرسید ہندوستانی مسلمانوں کو جدید تعلیم دینا چاہتے تھے بلکہ مخالفت کی وجہ سرسید احمد خاں کے مذہبی نظریات تھے۔ سرسید اور علما کے باہمی اختلاف کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ رقم طراز ہیں:

''عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سرسید انگریزی تعلیم پھیلانا چاہتے تھے اور ملک کے بعض دوسرے عناصر، خصوصاً علما انگریزی تعلیم کو مذہباً ناجائز سمجھتے تھے مگر یہ رائے منصفانہ نہیں۔ انصاف یہ ہے کہ اس معاملے میں علما کو اختلاف سرسید کے مذہبی عقائد سے یا پھر انگریزی تمدن سے تھا۔ ان کو

انگریزی تعلیم سے اختلاف نہ تھا۔'' [۵]

سر سید اور علما کے اختلاف کے معاملے پر اور بھی کئی محققین اور صاحبان علم و دانش نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس حوالے سے شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

> ''علی گڑھ کالج کی مخالفت اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ وہاں مغربی علوم پڑھائے جاتے تھے بلکہ اس لیے کہ اس کی بنا میں سر سید کا ہاتھ تھا اور سر سید اپنی کتب اور **تہذیب الاخلاق** میں معاشرتی اور مذہبی مسائل کے متعلق ایسے عقائد کا اظہار کر رہے تھے جنھیں عام مسلمان اسلام کے خلاف سمجھتے تھے۔ علی گڑھ کالج کے متعلق سخت سے سخت مضامین اور دُرُشت سے درشت فتاویٰ میں یہ نہیں لکھا کہ انگریزی پڑھنا کفر ہے''۔ [۶]

شیخ اکرام کے اس بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علما کی سر سید مخالفت کی وجہ کوئی اور نہ تھی بلکہ مغربی نظریات تھے جنھیں وہ ناپسند کرتے تھے جبکہ سر سید وقت کی ضرورت کے مطابق مسلمانوں کے لیے اپنے یہ جدید نظریات پیش کر رہے تھے۔

سر سید کے مذہبی نظریات سے اختلاف رکھنے والوں میں صرف علما ہی نہیں تھے بلکہ بہت سے مسلم دانشور بھی شامل تھے جن کا خیال تھا کہ سر سید کے مذہبی نظریات درست نہیں۔ ایسے دانشوروں نے واضح الفاظ میں اس بات کا اظہار کیا کہ انھیں سر سید کی ذات یا ان کے انگریزوں سے میل جول اور تعلق پر اعتراض نہیں بلکہ اعتراض ان کے مذہبی خیالات پر ہے۔ اس حوالے سے سر سید کے ہم عصر علی بخش خاں لکھتے ہیں:

> ''مجھ کو اس وقت بلکہ مدت سے سخت افسوس ہے کہ ہماری قوم میں سید احمد خاں ایک شخص لائق اور نامور اور معزز اور ذی عقل پیدا ہوئے اور ترقی قومی پر آمادہ ہونا اُن کا ارادہ ظاہر کیا گیا مگر اپنی خود رائی سے مذہبی دست اندازی وانقلاب دین ایسا اُن کی طبیعت میں جم گیا کہ اصلی غرض فوت ہو گئی اور تمام قوم کو اُن سے نفرت پیدا ہو گئی ہے۔ مجھ کو بھی جس قدر مخالفت ہے اُن کے خیالات مذہبی سے ہے، نہ اُن کی ذات خاص یا تعلیم علوم جدیدہ سے۔'' [۷]

مسلم دانشوروں اور علمائے کرام نے سرسید سے جو اختلاف کیا وہ ان کے مذہبی نظریات کی وجہ سے تھا جو انھوں نے رسالہ **تہذیب الاخلاق** اور **تفسیر قرآن** میں پیش کیے۔ سرسید نے بہت سے حوالوں سے جمہور مسلم علما کے نظریات سے ہٹ کر لکھا اور ایسی بات لکھ گئے جو ان کی مخالفت کا سبب بنی۔ یہ نظریات اس حد تک نا قابلِ قبول تھے کہ سرسید کے رفقا بھی انھیں قبول نہ کر سکے۔ سرسید کی مخالفت بعد کے زمانے میں بھی ہوئی مگر اس کی واحد وجہ ان کے مذہبی اختلافات تھے نہ کہ جدید تعلیم کے لیے ان کی کوشش اور انگریزوں سے میل جول۔ اس حوالے سے ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

> ''سرسید کے وہ مخالفین جو مذہبی حیثیت سے سرسید کے مخالف تھے، ان کی مخالفت اس لیے نہیں تھی کہ سرسید ان انگریزوں کا ساتھ دیتے ہیں جو کوٹ پتلون پہنتے ہیں، کانٹے چھری سے کھاتے ہیں اور جو اپنے ساتھ ریل، تار، انجن، مشین، بھاپ، ہوٹل اور ہسپتال وغیرہ لے آئے ہیں بلکہ ان کی مخالفت کی ساری بنیاد سرسید کے مذہبی خیالات تھے جو قرآن و حدیث کی تفسیر کے بارے میں تھے۔ انھیں یہ ڈر تھا کہ کہیں سرسید قوم کو سدھارنے کی دھن میں مسلمانوں کا مذہب ہی نہ بدل دیں۔''[۸]

سرسید نے اختلاف کی بنیادی وجہ ان کے مذہبی عقائد و نظریات تھے۔ وہ بین المسالکی اختلاف تو آج بھی موجود ہے۔ تاہم سرسید کی ملی و قومی خدمات کے حوالے سے کسی کو اختلاف نہ تھا۔

ہندوستان بھر کے بہت سے علما اور مسلم دانشوروں نے سرسید کے مذہبی نظریات سے اختلاف کیا لیکن ہندوستانی مسلمانوں کا ایک طبقہ ایسا بھی موجود تھا جس نے نہ صرف سرسید کے مذہبی خیالات و نظریات کو پسند کیا بلکہ ان کی تعریف و توصیف بھی کی۔ اگرچہ سرسید علم الکلام اور تعقل پسندی/منطق میں اس حد تک چلے گئے کہ معجزات کو بھی عقل اور سائنس کی بنیادوں پر ثابت کرنے کے خواہش مند تھے، تاہم ایک خدمت ان کی یہ ہے کہ مذہب پر جو نئی تحقیقات نہیں ہو رہی تھیں، اجتہاد کے دروازے بند تھے، تقلید جامد کی روش عام تھی، اس جمود کو سرسید نے توڑا۔ مولانا حالی نے سرسید کے مذہبی نظریات سے اختلاف کے باوجود **تفسیر قرآن** کو سرسید کی ایک جلیل القدر مذہبی تصنیف قرار دیا۔ اس حوالے سے مولانا حالی نے لکھا ہے:

''اگرچہ سرسید نے اس تفسیر میں جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض مقامات پر ان سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں، بایں ہمہ اس تفسیر کو ہم ان کی مذہبی خدمات میں ایک نہایت جلیل القدر خدمت سمجھتے ہیں۔''[۹]

مولانا حالی کے ساتھ ساتھ ہندوستان بھر کے اور بھی بہت سے اہلِ قلم ایسے ہیں جنھوں نے سرسید کے مذہبی خیالات کو سراہا اور ان کی تحسین کی۔ انھوں نے سرسید کے مذہبی نظریات کو اس حوالے سے سراہا کہ سرسید نے مسلمانوں کو علمی حوالے سے ہندوؤں اور انگریزوں کے مقابل کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ سرسید کی تفسیر قرآن کے حوالے سے ڈاکٹر خیال امروہوی لکھتے ہیں:

''سرسید نے اپنے دور میں قرآن کی جدید انداز سے تفسیر کی اور طبقاتی اعتبار سے مسلمانوں کو انگریزوں اور ہندوؤں کے مقابل علمی اور نظریاتی طور پر اونچا کرنے کی عالمانہ کوشش کی، مجبور انسانوں کو مذہبی تعصّبات کی دلدل سے نکال کر سیکولر ذہن پیدا کرنے کے لیے تحریک چلائی۔ اس اعتبار سے بلاشبہ برصغیر پاک و ہند کے عوام سرسید کے احسانات کو ہرگز فراموش نہیں کر سکتے۔''[۱۰]

ضیاء الدین لاہوری نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ سرسید کی مخالفت ان کے مذہبی نظریات کی وجہ سے ہوئی۔ ان کی ذات یا جدید تعلیم کے لیے ان کی کوشش سے کسی کو اختلاف نہ تھا۔ انھوں نے ٹھوس دلائل اور ابتدائی مآخذ کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ سرسید کی مخالفت کی وجہ جدید تعلیم نہیں تھی بلکہ ان کے مذہبی نظریات تھے۔

ذریعہ تعلیم انگریزی یا اردو

سرسید کے حامیوں نے اس تاثر کو بھی عام کیا کہ سرسید انگریزی کی بجائے اردو ذریعہ تعلیم کے حامی تھے اور وہ اردو کو ہی ذریعہ تعلیم دلوانے کے لیے کوشاں رہے۔ یہ بات درست ہے کہ سرسید احمد خاں ابتدائی دور میں اردو میں تعلیم کے حامی تھے۔ اور اسی بات کے حق میں تھے کہ ہندوستان کے لوگوں کو تعلیم ان کی اپنی زبان میں دی جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہندوستان کو شائستگی

اور تربیت کا درجہ نصیب نہیں ہوگا۔ اس حوالے سے سرسید کا کہنا تھا:

''اگر تمام علوم ہندوستان کو اسی کی زبان میں نہ دیئے جائیں گے، کبھی ہندوستان کو شائستگی و تربیت کا درجہ نصیب نہیں ہونے کا۔ یہی سچ ہے، یہی سچ ہے، یہی سچ ہے۔''[۱۱]

سرسید کے اسی بیان کی بنیاد پر یہ تاثر عام ہوا کہ وہ اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے حق میں تھے۔ بہت سے لکھنے والوں نے اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ اس حوالے نے مولوی عبدالحق نے لکھا:

''قصرِ پاکستان کی بنیاد میں ''پہلی اینٹ'' اسی پیرمرد (سرسید) کے مبارک ہاتھوں نے رکھی اور وہ اینٹ اردو زبان تھی۔''[۱۲]

سرسید ابتدا میں مقامی زبانوں یا زبان میں تعلیم کے حق میں تھے مگر سفر یورپ ۱۸۷۰ء کے بعد ان کے خیالات میں تبدیلی آئی۔ وہ یورپ میں جدید معیارِ تعلیم سے بہت متاثر ہوئے اور مسلمانوں کی تعمیر و ترقی کے لیے جدید علوم کی تعلیم ضروری سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے اس نظریے کا اظہار کیا کہ مقامی زبانیں اس قابل نہیں کہ ان میں جدید علوم کی تعلیم دی جا سکے لہٰذا جدید علوم کی اعلیٰ تعلیم صرف اور صرف انگریزی زبان میں ہی ممکن ہے۔ وہ اس حوالے سے لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی کے پوری طرح ہم خیال تھے جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان کے لوگوں کی تعلیم و ترتیب دیسی زبانوں میں کرنے کی بجائے کسی دوسری زبان کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ لارڈ میکالے نے ۱۸۳۵ء میں نظامِ تعلیم کی تبدیلی کے حوالے سے پیش کی جانے والی یادداشت میں لکھا تھا:

''تمام طبقے اس بات پر متفق ہیں کہ ہندوستان کے اس حصہ کے بسنے والے جو مختلف بولیاں بولتے ہیں، وہ ادبی و علمی معلومات سے یکسر تہی دامن ہیں۔ پھر اُن کے الفاظ کا ذخیرہ اس قدر کم اور انداز بیان اس حد تک ناتراشیدہ ہے کہ جب تک اُنھیں کسی اور ذریعہ سے وسیع نہ کیا جائے۔ اُن میں کسی قابلِ قدر علمی کام کو منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ چیز اب بدیہی حقیقت کے طور پر سامنے آ چکی ہے کہ اس ملک کے جو طبقے اعلیٰ تعلیم پانے کے وسائل رکھتے ہیں، اُن کی ذہنی نشوونما دیسی زبانوں کے سوا کسی دوسری

زبان کے ذریعہ سے ہی ممکن ہے۔

''ہم اس حقیقت سے پوری طرح آشنا ہیں کہ ساری قوموں کے لوگ ہماری زبان سے اس حد تک واقف ہیں جس سے وہ بآسانی اُن دقیق اور پیچیدہ مسائل کو سمجھ سکتے ہیں جس سے اس زبان کا دامن بھرپور ہے او راس کے ذریعے وہ ان ادبی طاقتوں سے بھی پوری طرح لطف اندوز ہونے کی استعداد رکھتے ہیں جو ہمارے ہاں کے اعلیٰ انشا پردازوں کی تحریروں میں موجود ہیں۔''[۱۳]

سرسید نے جب تعلیمی معاملات میں دلچسپی لینا شروع کی تو انھوں نے اپنی رائے اسی حوالے سے اردو اور انگریزی میں لکھ کر شائع کی۔ اس کتابچے میں انھوں لارڈ میکالے سے اتفاق کرتے ہوئے اردو زبان کو تعلیم و تربیت کے لیے ناموزوں قرار دیا اور نام لیے بغیر انگریزی زبان میں ہندوستانیوں کی تعلیم و تربیت کی بات کی۔ انھوں نے تعلیمی حوالے سے اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا:

''ہم علوم مشرقی کی ترقی کے معنی نہیں سمجھتے، نہ علوم مغربی کا دیسی زبانوں کے ذریعے سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم تک شائع ہونا ممکن جانتے ہیں

''علوم مشرقی کی ترقی اور چھوٹی موٹی ترجمہ کی ہوئی کتابیں ہم کو کیا نتیجہ دیں گی اور ہم کو کون سی عزت و دولت و حشمت و حکومت بخشیں گی؟

''...... یونیورسٹی کالج لاہور، جو پوری یونیورسٹی ہونے والا ہے، بجز اس کے کہ ہم کو سیدھی راہ چلنے سے روکے، ہم کو ہمارے حقوق سے محروم رکھے، ہم کو اس لائق نہ ہونے دے کہ ہم اپنے حقوق کا دعویٰ کر سکیں، ہمارے حق میں اور کیا کر سکتا ہے؟...... ہم کو علوم مشرقی کے زندہ کرنے اور مشرقی زبانوں کے ترقی دینے کے جال میں پھنسانا صرف ایسی تدبیریں کرنا ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہم کو ہماری ترقیات حاصل کرنے سے روکا جائے....... پس پنجاب یونیورسٹی اگر وہ قائم ہو جائے تو ہمارے حق میں بجز اس کے کہ ہماری اعلیٰ درجہ کی یورپین تعلیم کو برباد کر

دے اور اس پالیسی پر عمل کرے جو ہمیں برباد کرنے والی ہے، اور کیا کرے گی؟''[۱۴]

اورینٹل کالج کا قیام عمل میں آیا تو سرسید احمد خاں نے اس کی مخالفت بھی اسی وجہ سے کی کہ اورینٹل کالج مشرقی علوم کی درس گاہ بننے جا رہا تھا اور سرسید احمد خاں انگریزی تعلیم کی اہمیت کے حامی تھے۔

انھوں نے متعدد تحریروں اور تقریروں میں اورینٹل کالج کی مخالفت کی ڈاکٹر زاہد منیر عامر تاریخ جامعہ پنجاب میں لکھتے ہیں:

''دراصل بات یہ تھی کہ سرسید احمد خاں مغرب اور مغربی علوم وفنون کو ہندوستانیوں کی ترقی کے لیے جس درجہ ضروری سمجھتے تھے، اورینٹل کالج یا پنجاب یونی ورسٹی مغربی علوم وفنون کے اس درجے کے داعی نہیں تھے۔ اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان اداروں میں مغربی علوم وفنون کی راہیں بند کر دی گئی تھیں یا ایسا کوئی عزم ظاہر کیا گیا تھا، پنجاب یونی ورسٹی کالج کے قیام کے وقت بھی اس بات کا اظہار کیا گیا تھا کہ انگریزی تعلیم، مجوزہ یونی ورسٹی میں تعلیم کی ایک بڑی شاخ ہوگی اور وہ مضامین کہ جن میں دیسی زبان میں تعلیم اور امتحان دینا ممکن نہیں ہے ان میں انگریزی کو اختیار کیا جائے گا اور یہ یونی ورسٹی اس بات کا اہتمام کرے گی کہ تمام علوم وفنون دیسی زبانوں کے ذریعے یورپین طریق تعلیم کے موجب سکھلائے جائیں گے، تعلیم اگرچہ دیسی زبان میں ہوگی مگر اس کی نگرانی ایسی ہوگی کہ طلبا کو فوائد تعلیم حاصل رہیں جو ہندوستان کی دیگر یونی ورسٹیوں سے حاصل ہوتے ہیں۔''[۱۵]

سرسید احمد خاں نے مقامی زبانوں کو جدید علوم کی تعلیم کے لیے ناموزوں قرار دیا۔ ان کی یہ بات کسی حد تک درست تھی کیونکہ ہندوستان کی مقامی زبانوں میں شاید کوئی بھی زبان اس وقت تک اتنی وقیع نہیں تھی کہ جدید علوم اس میں پڑھائے جا سکتے، نہ جدید علوم کی کتب مقامی زبانوں میں تھیں۔ اسی لیے سرسید نے مقامی زبانوں پر انگریزی کو ترجیح دی۔ کیونکہ ان کے خیال

میں انگریزی زبان میں جدید علوم کی تعلیم کے لیے جو وسعت تھی کوئی مقامی زبان اس قابل نہ تھی۔ لہٰذا سرسید نے کہا:

''اردو زبان، جس کے وسیلہ سے اکثر جگہ تعلیم جاری ہے، اس کی حالت ایسی نہیں ہے جس سے تعلیم ہونا ممکن ہو کیونکہ جس زبان میں ہم کسی قوم کی تعلیم کا ارادہ رکھتے ہیں، اس زبان کی نسبت ہم کو اول یہ دیکھنا چاہیے کہ اس میں علمی کتابیں کافی موجود ہیں یا نہیں، کیونکہ اگر یہ نہ ہو تو تعلیم ممکن نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ زبان فی نفسہ اس قابل ہے یا نہیں کہ اس میں علمی کتابیں تصنیف ہوسکیں، کیونکہ پہلی بات کا تو علاج ہوسکتا ہے مگر دوسری بات لا علاج ہے۔ تیسرے یہ کہ آیا وہ ایسی زبان ہے یا نہیں کہ اس میں علوم پڑھنے سے جودت طبع، حدت ذہن، سلاست فکر، ملکہ عالی، قوت ناطقہ، پختگی تقریر اور ترتیب ودلائل کا سلیقہ پیدا ہو سکے؟ ان تینوں باتوں میں سے اردو زبان میں کوئی بات نہیں۔ پس گورنمنٹ پر واجب ہے کہ اس طریقہ تعلیم کو جو درحقیقت تربیت انسان کو خراب کرنے والا اور خود بخود لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا کرنے والا ہے، بالکل بدل دے اور اس زبان میں تربیت جاری کرے جس سے تربیت کا جو اصلی نتیجہ ہے وہ حاصل ہو۔ میری صاف رائے ہے کہ اگر گورنمنٹ اپنی شرکت دیسی زبان میں تعلیم دینے سے بالکل اٹھا دے اور صرف انگریزی مدرسے اور اسکول جاری رکھے تو بلاشبہ یہ بدگمانی جو رعایا کو گورنمنٹ کی طرف سے ہے، جاتی رہے۔ صاف صاف لوگ جان لیں کہ سرکار انگریزی زبان کے وسیلہ سے تربیت کرتی ہے اور انگریزی زبان بلاشبہ ایسی ہے کہ انسان کی ہر قسم کی علمی ترقی اس میں ہوسکتی ہے۔''[16]

سرسید احمد خاں نے اور موقع پر اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا۔

''انگریزی، قطع نظر اس کے کہ وہ ہمارے حاکموں کی بھی زبان ہے اور علاوہ علوم حاصل کرنے کے اور بہت سے وجوہ سے ہمارے بکار آمد ہے،

ہمارے دسترس میں ہے اور اس لیے لازم ہو گیا ہے کہ ہم اسی زبان میں ان علوم کو حاصل کریں۔'' [۱۷]

سرسید احمد خاں مردوں کی تعلیم کے تو حق میں تھے مگر خواتین کی جدید تعلیم کی طرف ان کی کوئی توجہ نہ تھی۔ اس حوالے سے ان کا خیال تھا کہ خواتین کو جدید تعلیم دینے کی ضرورت نہیں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر موجودہ حالات میں خواتین کو جدید تعلیم دی گئی تو اس کے نتائج اچھے نہ ہوں اور اس مقصد کے لیے خرچ کی جانے والی رقم اور محنت برباد ہو جائے گی۔ سرسید کا خیال تھا کہ عورتوں کی تعلیم کے لیے قدیم ترین طریقہ کار ہی مفید ہے اور وہ کتب جو ہماری دادیاں اور نانیاں پڑھ آئی ہیں۔ آج بھی خواتین کی تعلیم و تربیت کے لیے مفید ہیں۔ اس حوالے سے سرسید کا کہنا تھا:

''حقیقت یہ ہے کہ مسلمان عورتوں کی پوری تعلیم اُس وقت تک نہ ہوگی جب تک اس قوم کے اکثر مرد پورے تعلیم یافتہ نہ ہو جائیں گے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی سوشل حالت پر غور کیا جائے تو اس وقت تک جو حالت مسلمان عورتوں کی ہے، وہ میری رائے میں خانگی خوشی کے واسطے کافی ہے۔ جو کچھ بالفعل گورنمنٹ کو کرنا ہے، وہ یہ ہے مسلمان لڑکوں کی تعلیم و تربیت کے بندوبست کی جانب کافی توجہ کرے۔ اگر گورنمنٹ مسلمان شریف خاندانوں میں تعلیم نسواں کے جاری کرنے کی کوشش کرے گی تو حالت موجودہ میں محض ناکامی حاصل ہوگی اور میری رائے ناقص میں اس سے مضر نتیجے پیدا ہوں گے اور روپیہ اور محنت ضائع جائے گی۔'' [۱۸]

سرسید کے خیال میں عورتوں کے لیے یہ تعلیم کافی تھی کہ وہ نیک اخلاق اور نیک عادات و خصائل سیکھ لیں، امورِ خانہ داری اور بچوں کی پرورش کی ماہر ہو جائیں، مذہبی عقائد کو جان لیں اور بس۔ سرسید لکھتے ہیں:

''میری یہ خواہش نہیں ہے کہ تم اُن مقدس کتابوں کے بدلے، جو تمہاری دادیاں اور نانیاں پڑھتی آئی ہیں، اس زمانہ کی مروجہ نامبارک کتابوں کا پڑھنا اختیار کرو جو اس زمانہ میں پھیلتی جاتی ہیں۔ سچی تعلیم نہایت عمدگی

سے اُن کتابوں سے حاصل ہوتی ہے جو تمہاری دادیاں نانیاں پڑھتی تھیں۔ جیسی وہ اُس زمانہ میں مفید تھیں ویسی ہی اس زمانہ میں مفید ہیں۔"[۱۹]

سرسید احمد خاں نے عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کی مخالفت ہندوستان کے حالات کو دیکھتے ہوئے کی۔ ہندوستان میں عورتوں کی ملازمت کا اس وقت تک کوئی تصور نہ تھا اس لیے سرسید یہ سمجھتے تھے کہ عورتوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرنی چاہیے۔ بعض لوگ جو خواتین کی اعلیٰ تعلیم کے حق میں تھے انھیں مخاطب کرتے ہوئے سرسید نے کہا تھا:

"وہ علوم ـــ جن کو اس زمانہ میں یورپ کی تقلید سے لڑکیوں کی تعلیم میں لوگ داخل کرنا چاہتے ہیں، یورپ کی اور امریکہ کی حالت معاشرت کے خیال سے وہ علوم لڑکیوں کو سکھانے ضرور ہوں کیونکہ ممکن ہے کہ وہاں عورتیں پوسٹ ماسٹر اور ٹیلی گراف ماسٹرز یا پارلیمنٹ کی ممبر ہو سکیں لیکن ہندوستان میں نہ وہ زمانہ ہے، نہ سینکڑوں برس بعد بھی آنے والا ہے۔"[۲۰]

سرسید احمد خاں نے درج بالا وجوہ کی بنیاد پر خواتین کو جدید اعلیٰ تعلیم دینے کی مخالفت کی تھی ہندوستانی عورت کا کام گھریلو ذمہ داریاں اور بچوں کی نگہداشت ہے سو ایسی تعلیم وہ بزرگ خواتین سے حاصل کر لیتی ہیں۔ لیکن سرسید کی مخالفت کرنے والے طبقے نے تاثر دیا کہ سرسید خواتین کو اس قابل ہی نہ سمجھتے تھے کہ انھیں اعلیٰ تعلیم دی جائے۔

سرسید احمد خاں نے مسلمانوں میں جدید مغربی علوم کو فروغ دینے کے لیے علی گڑھ میں ایک کالج قائم کیا۔ یہ کالج ترقی کرتے کرتے آخر کار یونیورسٹی تک پہنچ گیا۔ اس ادارے نے برصغیر پاک و ہند میں جدید مغربی علوم کے حصول میں اہم کردار ادا کیا۔ سرسید نے بہت سے مواقع پر اس کالج کے قیام کی غرض و غایت بیان کی۔ یہ کالج برصغیر کے مسلمانوں میں جدید مغربی علوم کو فروغ دینے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اس حوالے سے سرسید کا بیان ہے:

"اصلی مقصد اس کالج کا یہ ہے کہ مسلمانوں میں عموماً اور بالتخصیص اعلیٰ درجہ کے مسلمان خاندانوں میں یورپین سائنسز اور لٹریچر کو رواج دے اور ایک ایسا فرقہ پیدا کرے جو ازرُوئے خون اور رنگ کے ہندوستانی ہوں مگر باعتبار مذاق اور رائے و فہم کے انگریز ہوں۔"[۲۱]

اسی کے ساتھ ساتھ سرسید نے علی گڑھ کالج کے قیام کے مقصد پر بات کرتے یہ بھی کہا کہ کالج قائم کرنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں دوستانہ مراسم پیدا ہوں اور فریقین کے مابین جو تعصب اور نفرت ہے وہ دور ہو۔ اسی حوالے سے سرسید کا خیال تھا کہ جب تک دونوں اقوام میں اعتماد کی فضا قائم نہیں ہوگی مسلمانان ہند خسارے میں رہیں گے۔ اسی لیے ان کا کہنا تھا:

> ''میرا سب سے بڑا مقصد کالج کے قائم کرنے سے یہ ہے کہ مسلمانوں میں اور انگریزوں میں دوستانہ راہ و رسم پیدا ہو اور آپس کا تعصب اور نفرت دور ہو۔''[۲۲]

سرسید نے اس حوالے سے مزید کہا:

> ''مجھے اُمید ہے کہ تم اِس نشان کو اپنے دلوں میں بھی نقش کرو گے اور یاد رکھو گے کہ اس کالج کا بڑا مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں اتحاد ہو اور وہ ایک دوسرے کے اغراض میں یک جان اور دو قالب ہو کر، جیسا کہ اس نشان میں کریسنٹ اور کراس یک جان و دو قالب ہیں، شریک رہیں گے۔''[۲۳]

سرسید دراصل مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان کی نفرت ختم کر کے مسلمانوں کے حکومت کے ساتھ تعلقات میں بہتری کے خواہاں تھے۔ ان کے خیال میں حکومت اور مسلمانوں کی دوری مسلمانوں ہی کو نقصان پہنچائے گی۔ علی گڑھ کالج کے قیام کے مقاصد پر بات کرتے ہوئے سرسید نے یہ کہا:

> ''ہندوستان کے مسلمانوں کو سلطنت انگریزی کی لائق و کارآمد رعایا بنانا اور اُن کی طبیعتوں میں اس قسم کی خیرخواہی پیدا کرنا جو ایک غیر سلطنت کی غلامانہ اطاعت سے نہیں بلکہ عمدہ گورنمنٹ کی برکتوں کی اصل قدر شناسی سے پیدا ہوتی ہے۔''[۲۴]

علی گڑھ کالج نے اپنے قیام کے تھوڑے ہی عرصے بعد وہ مقبولیت حاصل کی جو بہت کم اداروں کو مل سکی۔ سرسید اس ادارے کی ترقی اور روز بروز بڑھتی طلبہ کی تعداد سے بھی بہت خوش

تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ کالج نے اپنے قیام کے بیس سال کے اندر جو تعداد طلبہ میں ترقی کی ہے ہم کو اس کی توقع نہ تھی۔ مزید یہ کہ اس ادارے نے انگریزی حکومت اور مسلمانانِ ہند کے مابین فاصلے کم کرنے کے لیے جو کوشش کی اس کے بھی خاطر خواہ نتائج سامنے آئے۔ اس بات پر انگریزی حکام نے بھی خوشی کا اظہار کیا کہ اس کالج کے فارغ التحصیل انگریزی حکومت کے سچے خیر خواہ ہیں۔

علی گڑھ کالج نے بلا شبہ بہت ترقی کی اور انگریزی حکومت اور مسلمانوں کے درمیان فاصلوں کو کم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ عام لوگ اس ادارے کے نتائج سے مطمئن نہیں تھے۔ سرسید کے بہت سے قریبی ساتھیوں کا بھی یہ خیال تھا کہ علی گڑھ کالج وہ نتائج دینے میں ناکام رہا جن کی اس ادارے سے توقع کی جا رہی تھی۔ مولانا حالی نے اس حوالے سے ان خیالات کا اظہار کیا:

> ''اِن نتائج سے محمڈن کالج کی کوئی ایسی خصوصیات ظاہر نہیں ہوتی جس کی رُو سے اس کو ہندوستان کے اور کالجوں پر ترجیح دی جا سکے یا اِس کو مسلمانوں کے حق میں زیادہ مفید سمجھا جائے۔ سوا اس کے کہ اس کالج میں ہندوستان کے اور کالجوں کی نسبت مسلمان طلبہ کی تعداد کسی قدر زیادہ پائی جاتی ہے، کوئی تفاوت تعلیم اور نتائج تعلیم کے لحاظ سے محسوس نہیں ہوتا۔ نہ یہاں کے طالب علموں نے آج تک فضیلت اور علمی لیاقت میں اور کالجوں کے طلبہ پر کوئی صریح فوقیت دکھائی ہے اور نہ یہ ثابت کیا ہے کہ یونیورسٹی کے نتائج امتحان میں اس کالج کے تعلیم یافتہ بہ نسبت دیگر کالجوں کے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ پس تاوقتیکہ کوئی وجہ امتیاز کی نہ بتائی جائے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر اور اس سے مفید تر کوئی انسٹی ٹیوشن نہیں ہے۔''[۲۵]

اس بحث کے بعد ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ سرسید کے پیش نظر علی گڑھ کالج کے قیام کا مقصد مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم بھی تھا اور انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان فاصلوں کو کم کرنا بھی۔ اس زمانے میں کہ جب مسلمانان ہند اپنا اقتدار کھو بیٹھے تھے اور ان کے اور انگریزوں کے درمیان اعتماد کا رشتہ قائم نہ تھا ایسی کسی کوشش کا کیا جانا بے حد ضروری تھا تا کہ دونوں اقوام ایک دوسرے کے قریب آ سکیں اور ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھ سکیں۔ مزید یہ کہ چونکہ مسلمان عسکری طور پر کمزور

تھے اس لیے حالات کے ساتھ سمجھوتہ ہی مسئلے کا حل تھا اور اسی کے لیے سرسید احمد خاں نے کوشش کی۔ کیونکہ حکومتِ وقت سے ٹکراؤ کا نقصان بہ ہر حال مسلمانان ہند کو ہی ہوتا اور ہندو اس صورتحال کا پوری طرح فائدہ اٹھاتے۔ لہٰذا سرسید نے جو کہا وہ تقاضائے وقت کے عین مطابق تھا۔ اسی وقت اگر سرسید بھی دوسرے بہت سے مسلمانوں کی طرح انگریزی حکومت کی مخالفت اور ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کرتے تو مسلمانانِ ہند جدید تعلیم سے محروم رہ جاتے اور کوئی ان کا پرسانِ حال نہ ہوتا۔ تاہم سرسید دور بین انسان تھے اور ان کی کاوشوں کے دوررس نتائج سامنے آئے۔ اس حوالے سے صفدر سلیمی لکھتے ہیں:

''اگر سرسید کا یہ شاہکار (مدرستہ العلوم) سامنے نہ آتا تو اس ملک کی فضاؤں میں نہ محمد علی جوہر اور ظفر علی خاں کے نعرہ ہائے حُریت سنائی دیتے، نہ اقبال کے حیات آفریں نغموں کی گونج فردوسِ گوش بنتی اور نہ وہ قائداعظم میدانِ قیادت میں نظر آتا جس کا تدبر برطانوی سامراج اور ہندو سامراج کے لیے ملک الموت ثابت ہوا اور مسلمانوں کے لیے ایک عظیم مملکت کا نقطۂ آغاز۔''[۲۶]

ریاض الرحمٰن شروانی نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''اس برصغیر میں تو مسلمان شُودروں سے بدتر ہوتے، اگر سرسید نے ان کی تعلیمی اور معاشرتی زندگی میں رہنمائی نہ کی ہوتی۔ سرسید کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے جتنا بڑا کارنامہ پچھلے سوا سو، ڈیڑھ سو برسوں میں کسی اور کا نہیں۔''[۲۷]

سرسید احمد خاں نے مسلمانانِ ہند کو جدید تعلیم سے روشناس کرایا۔ ان کی یہ خدمت کارِ عظیم ہے مگر اس حوالے سے یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ سرسید نے ہمیشہ رؤسا اور امرا کے بچوں کی تعلیم کی بات کی۔ کسی غریب اور نچلے طبقے کے مسلمانوں کے بچوں کی تعلیم و تربیت کی بات نہ کی۔ انھیں ہمیشہ امرا اور رؤسا کے لڑکوں کی تربیت کی فکر رہی۔ وہ اس بات پر پریشان رہتے تھے کہ امرا اور رؤسا کے لڑکوں کا اخلاق نچلے طبقے کے لڑکوں کے ساتھ یا بازاری لڑکوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے بگڑا جاتا ہے اور امرا اور رؤسا اس جانب کوئی توجہ نہیں دیتے۔ مزید یہ کہ وہی لڑکے جب بڑے ہوتے ہیں تو وہی بازاری اور نچلے طبقوں سے تعلق رکھنے والے لڑکے ان کے مصاحب بن جاتے

ہیں۔اس صورتحال سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ رؤسا اور امرا کے بچوں کی تعلیم وتربیت ان عام بچوں سے الگ رکھ کر کی جائے۔سرسید کا خیال تھا کہ امرا رؤسا کے بچے محنت سے عمدہ نتائج دے سکتے ہیں لہٰذا پہلے ان پر محنت کی جائے اور ایک ایسا طبقہ وجود میں آ جائے جو بعدازاں قومی تربیت میں مدد و معاون ہو۔وہ اخلاق وتربیت کے جس مرحلے پر فائز ہیں اس سے اوپر جانے کے بجائے نیچے آ رہے ہیں۔سرسید کو اس بات پر دکھ تھا۔امرا اور رؤسا کے بچوں کے حوالے سے کہتے ہیں:

> ''میں نے بڑے بڑے امیروں کے بچے دیکھے ہیں۔وہ نوکروں کے لونڈوں، اور اگر وہ نہیں تو بازاری لونڈوں، کی صحبت اُٹھاتے ہیں۔گالی گلوچ، بُرے الفاظ، بداخلاقی کی باتیں، خراب عادتیں سنتے، دیکھتے اور سیکھتے ہیں، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔''[۲۸]

سرسید اس حوالے سے امرا سے یہ سوال بھی کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے بچوں کی تربیت کے حوالے سے کیا کیا۔وہ لکھتے ہیں:

> ''میں پوچھتا ہوں کہ آپ صاحبوں نے اپنی اولاد کے اخلاق درست کرنے کی کیا تدبیر کی ہے؟ کیا آپ کے لڑکوں کے ساتھ آپ کے سائیس کے لونڈے نہیں کھیلتے یا ماماؤں اور اُن کے لڑکوں میں آپ کے لڑکے نہیں کھیلتے؟ کیا اپنے لڑکوں کو بازاری لونڈوں کی صحبت سے بچانے کے لیے آپ کچھ فکر فرماتے ہیں؟ ان سب باتوں کا جواب یہ ہے کہ کچھ نہیں۔ وہی بداخلاقی، بدزبانی، کمینہ عادت جو اُن کمینہ لونڈوں سے آپ کے لڑکے سنتے اور دیکھتے ہیں، وہی وہ بھی سیکھتے ہیں اور وہی بداخلاقی اُن میں اثر کر جاتی ہے۔''[۲۹]

امرا اور رؤسا کے بچوں کی تعلیم وتربیت کا انھوں نے یہ حل تجویز کیا کہ ان بچوں کو عام بچوں سے الگ رکھ کر ان کی تعلیم وتربیت کی جائے۔اس کے لیے انھوں نے مدرستہ العلوم کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس کا قیام لازمی قرار دیا تاکہ امرا کے بچے بورڈنگ ہاؤس میں رہ کر زندگی کی اعلیٰ اقدار سیکھیں۔اس حوالے سے سرسید کا یہ بھی کہنا تھا کہ انگلستان میں تمام بڑے لوگوں کے بچے بورڈنگ ہاؤس میں رہ کر ہی اعلیٰ تربیت حاصل کرتے ہیں۔

سرسید احمد خاں پر یہ اعتراض بھی اٹھایا جاتا ہے کہ انھوں نے امرا اور رؤسا کے بچوں کے لیے تو جدید اعلیٰ تعلیم کو لازمی قرار دیا مگر غریب افراد کے بچوں کے لیے انھوں نے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا، اس حوالے سے ان کا یہ خیال تھا کہ جس حیثیت اور درجے کے یہ لڑکے ہیں ان کو انگریزی پڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ان لڑکوں کے لیے صرف اتنی ہی تعلیم کافی ہے کہ انھیں لکھنا پڑھنا اور ضروری حساب کتاب آجائے۔مزید یہ کہ کچھ مذہبی تعلیم دے دی جائے۔اس طرح دیہاتی بچوں کی تعلیم کے حوالے سے بھی سرسید نے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا کہ انھیں دیسی زبان میں ''بدرجہ اعتدال'' لکھنا پڑھنا اور حساب سکھایا جائے۔

سرسید کی تمام تعلیمی کوششوں کا مطلب یہ ہوا کہ امرا کے بچوں کے لیے تو اعلیٰ تعلیم کا بندوبست کیا جائے جو ابتدائی تعلیم رکھتے ہیں،غربا اور نچلے طبقے کے بچوں کے لیے ابتدائی تعلیم یعنی دیسی زبان میں درجہ اعتدال تک تعلیم کافی ہے۔اس حوالے سے حفیظ ملک لکھتے ہیں:

> ''سرسید کی اس تمام تگ و دو کا مطلب یہ ہوا کہ غربا کے لڑکے تو ادنیٰ تعلیم بھی نہ حاصل کر پائیں اور اعلیٰ درجے تک کی کل تعلیم کے حقدار صرف امیر زادے ہوں۔ جب مالی لحاظ سے معاشرت پر پہلے سے حاوی اس طبقے کے افراد تعلیم پا کر حکومت کے اعلیٰ کلیدی عہدوں پر فائز ہو جائیں تو حاکمانہ رویے کے ساتھ ادنیٰ طبقے کے استحصال پر (جو ہمارے ہاں طبقاتی امتیاز کے شعور کا لازمی نتیجہ ہے) خوب قادر ہو سکیں گے۔اس مقصد کے حصول کے بعد غریب لڑکوں پر ادنیٰ تعلیم کے دروازے کھولے جائیں تاکہ وہ بڑے ہو کر وقت کی ضرورت کے مطابق ان کے بہتر خدمت گار ثابت ہو سکیں۔''[۳۰]

حفیظ ملک کی یہ رائے تعصب پر مبنی ہے ورنہ سرسید تمام طبقوں کی فلاح و بہبود ان کی لیاقت اور ذہنی سطح کے مطابق چاہتے تھے۔اس کے باوصف بعض لوگوں کے خیال میں سرسید کی تعلیمی پالیسی میں طبقاتی فرق بھی تھا۔مدرستہ العلوم علی گڑھ میں بورڈنگ ہاؤس قائم کیا تو اس میں تین درجے مقرر کیے۔ان درجوں میں باقاعدہ تفریق پائی جاتی تھی اور طالب علموں کے اندر بھی یہ طبقاتی احساس موجود تھا۔سرسید کی تعلیمی پالیسی کا یہ ایک کمزور پہلو تھا کہ ادنیٰ،کمتر اور نچلے درجے کے لوگ

بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اونچے عہدوں پر فائز ہو جائیں۔ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان برصغیر کے لوگوں میں ذات پات کے نظام سے وہ بخوبی آگاہ تھے اور سمجھتے تھے کہ اعلیٰ طبقے کے لوگ گوارا نہیں کریں گے کہ ادنیٰ طبقے کے لوگ ان پر حکومت کریں۔ لہٰذا سرسید نے تمام طبقوں کی تربیت کے لیے الگ الگ مراحل مرتب کیے۔ اس حوالے سے انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا:

> ''کیا ہمارے ملک کے رئیس اس کو پسند کریں گے کہ ادنیٰ قوم یا ادنیٰ درجے کا آدمی، خواہ اُس نے بی اے کی ڈگری لی ہو یا ایم اے کی، اور گو وہ لائق بھی ہو، اُن پر بیٹھ کر حکومت کرے؟ اُن کے مال، جائیداد اور عزت پر حاکم ہو؟ کبھی نہیں، کوئی ایک بھی پسند نہیں کرے گا۔''[۱۳۱]

سرسید کی تعلیمی تحریک نے ایک خاص طبقے یعنی اشرافیہ کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی مگر مدرستہ العلوم علی گڑھ کے محدود مالی وسائل کی وجہ سے نچلے طبقے کی تعلیم و تربیت کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دے سکے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اعلیٰ طبقے کے طلبہ اپنے تعلیمی اور بورڈنگ کے اخراجات برداشت کر سکتے تھے مگر غریب اور نچلے طبقے کے لیے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس ادارے سے نچلے طبقوں سے تعلق رکھنے والے نوجوان تعلیم حاصل نہ کر سکے اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ادنیٰ طبقے کے پڑھے لکھے آدمی کو کہ جب وہ مال و جائیداد پر حاکم ہو اسے کوئی بھی برداشت نہیں کرے گا۔

سرسید احمد خاں اور کانگرس

سرسید تحریک کا ایک اہم پہلو سیاسی تھا۔ ہندوستان میں پہلی سیاسی جماعت ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے بنی۔ سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو کانگریس میں شمولیت سے روکا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوؤں کی تعداد چونکہ زیادہ ہے اس لیے اگر مسلمان کانگریس میں شامل ہوئے تو ان کی کوئی حیثیت نہ ہوگی۔ سرسید نے ہندوستانی مسلمانوں کی توجہ ہندوؤں کی عددی اکثریت اور مسلمانوں کی اقلیت کی طرف دلائی۔ بلاشبہ یہ ایک کھلی حقیقت تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی ہندوؤں کے مقابلے میں بہت قلیل تھی اور اگر ہندوستان میں جمہوری طرز حکومت آتا تو ایسی صورت میں مسلمان خسارے میں رہتے۔ ہندو عددی اکثریت کی بنا پر ہمیشہ

غالب رہتے اور مسلمانوں کا کوئی پرسانِ حال نہ ہوتا۔ منتخب کونسلوں یا اسمبلیوں میں مسلمانوں کی نمائندگی برائے نام ہوتی، قوانین بناتے وقت ہندو اکثریت کے مفادات کا تحفظ کیا جاتا اور مسلمان اقلیت کے ساتھ نامناسب اور ظالمانہ رویہ روا رکھا جاتا۔ سرسید کا یہ بھی کہنا تھا کہ اگر کانگریس کے بڑھتے قدموں کو نہ روکا گیا تو اس کا انجام اچھا نہ ہوگا اور دوبارہ حکومت اور ہندوستانی عوام میں تناؤ بڑھ جائے گا، کشیدگی جنم لے گی اور اس کا انجام بھی غدر جیسا ہی ہوگا۔ اس حوالے سے سرسید کا خیال تھا:

''اگر کانگریس کا ایجی ٹیشن نہ روکا جائے تو اِس کا انجام ایک غدر ہوگا جس میں اس قسم کی مصیبتیں اور خوں ریزیاں ظہور میں آئیں گی جن کے مقابلے میں ۱۸۵۷ء کا غدر صرف بچوں کا ایک کھیل تھا۔ اس کانگریس کا ہنوز آغاز ہے لیکن چند برسوں کے بعد اس کو غالباً ایسی بڑی ترقی ہو جائے گی کہ اس کا روکنا نہایت دشوار ہوگا۔۔۔۔ اس کے باعث ملک کے امن وامان میں خلل واقع ہوگا اور آخر کار ایک بربادی پیدا کرنے والی آفت پیدا ہوگی۔ پس اے صاحبو! جس صورت میں ہمارے ملک کی یہ حالت ہے تو میں تاکیداً آپ کو اس بات کی صلاح دیتا ہوں کہ آپ اس مضرت ناک ایجی ٹیشن سے علیحدہ رہیں۔''[۳۲]

سرسید احمد خاں نے ایک طرف تو کانگریس کے غیر دانشمندانہ اور جذباتی جدوجہد پر تنقید کی اور دوسری طرف مسلمانوں کو تنبیہ کی کہ وہ سیاسی معاملات میں مداخلت نہ کریں۔ ایسا نہ ہو کہ پھر ملکی حالات تناؤ اور ٹکراؤ کی طرف بڑھیں اور دوبارہ غدر کی سی کیفیت کا سامنا کرنا پڑے۔ وہ لکھتے ہیں:

''غدر میں کیا ہوا؟ ہندوؤں نے شروع کیا، مسلمان دل جلے تھے وہ بیچ میں کود پڑے۔ ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے مگر مسلمان اور مسلمانوں کے خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔ یہی نتیجہ پولیٹیکل ایجی ٹیشن میں مسلمانوں کے شریک ہونے سے حاصل ہوگا۔''[۳۳]

سرسید احمد خاں نے ایک طرف تو مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہو کر سیاسی جدوجہد

میں شمولیت سے باز رہنے کی تلقین کی اور دوسری طرف ''انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن'' بھی قائم کی جس کی بنیاد انھوں نے کانگریس کی مخالفت میں رکھی۔ اس تنظیم کے قیام کے سلسلے میں انھوں نے جو اعلان شائع کروایا اس کی چند سطور یوں تھیں:

> ''مناسب ہے کہ ہندو مسلمان جو کانگریس کے خلاف ہیں اُن کی ایک ایسوسی ایشن بنائی جائے، اُس کا نام انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن ہو .... ہندو مسلمانوں کے علاوہ اگر کوئی انگریز ایسوسی ایشن کا رکن بننا چاہے تو ہم اُس کی اعانت کے ممنون ہوں گے...... رکنیت کے خواہاں اصحاب اپنے نام یا تو منشی امتیاز علی یا منشی نول کشور لکھنو یا راجا شیو پرشاد بنارس یا سید ظہور حسین وکیل ہائی کورٹ الہ آباد یا مسٹر تھیوڈور بیک یا راقم کے نام علی گڑھ بھیج دیں۔'' [۳۴]

سرسید نے اس ایسوسی ایشن کے جو اغراض و مقاصد متعین کیے ان میں ایک طرف تو کانگریس کے خطرناک عزائم کے سامنے بند باندھنا تھا اور دوسرے حکومت وقت کے ساتھ مصالحانہ رویہ اختیار کرنے پر زور دیا گیا تھا تا کہ مسلمانوں اور حکومت وقت کے مابین فاصلے کم ہوں۔ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کے قیام کے اغراض و مقاصد کی دفعہ ۲ کی شق (ج) یوں تھی

> ''ہندوستان میں امن کی بحالی اور برطانوی حکومت کے استحکام کے لیے جدوجہد کرنا اور عوام کے دلوں کو ایسے تمام مہلک جذبات سے پاک کرنا جو ملک کے طول وعرض میں کانگریس کے حامی عوام کے دلوں میں بھڑکا رہے ہیں اور جن کی وجہ سے عوام میں برطانوی حکومت کے تعلق سے بے اطمینانی پیدا ہونے لگی ہے۔'' [۳۵]

کانگریس کی مخالفت سے ان کا مقصد کانگریس کا راستہ روکنا اور انگریزی حکومت سے بہتر تعلقات استوار کرنا تھا۔ اسی سلسلے میں وہ حکومت کے دوام کے خواہش مند بھی تھے اور اس کی دعا بھی کرتے تھے، بعض مسلم دانشوروں نے سرسید کی اس پالیسی پر تنقید کی اور کہا کہ سرسید نے یہ سب حکومت وقت سے وفاداری نبھانے کی خاطر کیا۔ جو لوگ سرسید کے اِن اقدامات کو جائز سمجھتے ہیں اور اس کا پرچار کرتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں۔ ضیاء الدین لاہوری بھی یہی کہتے ہیں کہ جن

لوگوں نے سرسید کے اِن اقدامات کی حمایت کی انھوں نے سرسید کے خیالات کو اصل سیاق وسباق سے ہٹا کر پیش کیا۔ سرسید کے حوالے سے اس مغالطے کو خوب پھلایا گیا کہ ان کی طرف سے کانگرس کی مخالفت اس لیے کی گئی کہ کانگریس ملک میں ایجی ٹیشن کو ہوا دینا چاہتی تھی اور کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی، تاہم اس سلسلے میں ضیاء الدین لاہوری رقم طراز ہیں:

> ''سرسید نے کانگریس کے خلاف اپنی تحریک خاص مسلمانوں کے مفاد کے پیش نظر جاری کی یا اُن کا واحد مقصد انگریزی حکومت کی خیر خواہی اور وفاداری کے جذبات کو فروغ دے کر اُن کی سلطنت کو استحکام بخشنا تھا۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ سرسید ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت دائمی طور پر قائم رہنے کی خواہش کا برملا اظہار کرتے تھے اسی تمنا کی برآوری کے لیے زندگی وقف کیے رکھی مگر ہمارے آج کے دانشور حقائق کو چھپا کر اور اُن کے بعض الفاظ کو فلسفیانہ معانی پہنا کر تاریخ کا حلیہ بگاڑ رہے ہیں۔''
>
> ''اس پروپیگنڈے کے زیر اثر ماحول میں پرورش پانے والے غیر معمولی ذہین طلبا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ قارئین کے لیے بھی حقائق کو قبول کرنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔''[۳۶]

کانگرس کے بانی سر اے۔او۔ہیوم بھی انگریز تھے۔کانگرس حکومت کے زیر اثر جماعت تھی۔ اگر ضیاء الدین لاہوری کی بات درست مان لی جائے تو سرسید بھی کانگرس ہی میں شامل ہو جاتے، انھیں الگ سے ایسوسی ایشن بنانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

سرسید احمد خاں اور دوقومی نظریہ

دوقومی نظریہ ہندوستان کی تاریخ میں بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔اس نظریہ کا ذکر کے بغیر گذشتہ دوصدیوں کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ بیسویں صدی کی تاریخ کی بنیاد اس نظریے پر ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اسی نظریے کی بنیاد پر ہندوستان تقسیم ہوا اور مسلمانانِ ہند نے الگ وطن پاکستان قائم کیا۔

ہندوستان ایک ایسا خطۂ زمین ہے جہاں کئی مذاہب، کئی اقوام اور بہت سی نسلیں صدیوں سے آباد چلی آرہی ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں مغل اقتدار کے خاتمے اور انگریزی حکومت کے قیام کے بعد انگریزی حکومت نے اپنے خاص مقاصد کے تحت مقامی آبادی کو آپس میں لڑانے اور حکومت کرنے کی پالیسی پر کام شروع کیا۔ چنانچہ ۱۸٦۷ء میں بنارس کے ہندوؤں نے اردو زبان کے خلاف آواز بلند کی اور کہا کہ اردو کی بجائے بھاشا زبان اور دیوناگری رسم الخط کو رائج کیا جائے۔ سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ جب مجھے یقین ہوگیا کہ اب دونوں قومیں کسی کام میں اکٹھے شریک نہ ہوں گی اور دونوں قوموں کا ساتھ چلنا محال ہو جائے گا۔ اس حوالے سے سرسید نے لکھا:

> ''تیس برس کے عرصے سے مجھ کو ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا، خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، خیال پیدا ہوا ہے اور ہمیشہ میری خواہش یہ تھی کہ دونوں مل کر دونوں کی فلاح کے کاموں میں کوشش کریں، مگر جب سے ہندو صاحبوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اردو زبان اور فارسی کو، جو مسلمانوں کی حکومت اور اُن کی شہنشاہی ہندوستان کی باقی ماندہ نشانی ہے، مٹا دیا جائے اُس وقت سے مجھ کو یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمان باہم متفق ہو کر ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کر سکتے۔''[۳۷]

سرسید نے اس رپورٹ میں اس بات پر دکھ کا اظہار کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین اختلاف رونما ہوا اور وہ باہم متفق و متحد ہو کر ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کے لیے کام نہیں کر سکتے۔ سرسید نے ملکی ترقی اور عوامی فلاح کی بات کی مگر ہمارے ہاں یہ نتیجہ اخذ کر لیا گیا کہ یہاں سرسید نے تقسیم کی پیشین گوئی کی ہے حالانکہ ہندوستان کی تقسیم تو اس صورت میں ممکن تھی کہ انگریزی اقتدار کا خاتمہ ہو جاتا جس کا قریب قریب کوئی امکان نہ تھا۔ سرسید یہ جان گئے تھے کہ ہندو اور مسلمانوں کے مفادات الگ الگ ہیں اور یہ دونوں قومیں حکومت برطانیہ کے تحت یا باہر اکٹھی نہیں رہ سکتیں۔ البتہ وہ دونوں کو متحد کرنے کی کاوشیں کرتے رہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے قوم کی پہچان وطن کو قرار دیا نہ کہ مذہب کو۔ سرسید نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک ملک کے باشندے ہونے کی حیثیت سے ایک قوم قرار دیا۔ سرسید نے اس بات کا پرچار کیا کہ قوم سے مراد ہندو اور مسلمان دونوں ہیں۔ اس حوالے سے ان کی تقریر کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"لفظ "قوم" سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ یہی وہ معانی ہیں جس میں لفظ "نیشن (Nation)" کی تعبیر کرتا ہوں۔ میرے نزدیک ایک یہ امر چنداں لحاظ کے لائق نہیں ہے کہ اُن کا مذہبی عقیدہ کیا ہے کیونکہ ہم اس کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں، ایک ہی حاکم کے زیرِ حکومت ہیں، ہم سب کے فائدے کے مخرج ایک ہی ہیں، ہم سب قحط کی مصیبتوں کو برابر برداشت کرتے ہیں۔ یہی مختلف وجوہات ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں قوموں کی، جو ہندوستان میں آباد ہیں، ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ ہندو یعنی ہندوستان کی رہنے والی قوم۔"[۳۸]

سرسید احمد خاں نے ۱۸۸۴ء میں لاہور میں ہندوؤں کے ایک وفد سے گفتگو کرتے ہوئے بھی کہا:

"ہندو میری رائے میں کسی مذہب کا نام نہیں ہے بلکہ ہر ایک شخص ہندوستان میں رہنے والا اپنے تئیں ہندو کہہ سکتا ہے۔ پس مجھے نہایت افسوس ہے کہ آپ مجھ کو باوجود اس کے کہ میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں، ہندو نہیں سمجھتے.........اہلِ ہنود صاحبان اپنے تئیں ہندو یعنی باشندہ ہند خیال کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو اجنبی خیال کرنے لگتے ہیں حالانکہ ہندو اور مسلمان دونوں قومیں ہندو یعنی اہل ہند کے خطاب کے مستحق ہیں۔ صاحبو! وہ زمانہ اب نہیں کہ صرف مذہب کے خیال سے ایک ملک کے باشندے دو قومیں سمجھے جائیں۔"[۳۹]

سرسید احمد خاں کا خیال تھا کہ دونوں قومیں ہندوستان میں اس طرح سے آباد ہیں کہ ان کا گھر ایک دوسرے سے ملا ہوا ہے۔ ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے۔ ایک ہی آب و ہوا میں پرورش پاتے ہیں۔ ایک سا پانی پیتے ہیں۔ مرنے جینے میں ایک دوسرے کے رنج و غم اور دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کو ملے بغیر چارہ نہیں۔ اس لیے یہ سب ایک قوم ہیں، کیونکہ قوم کے لفظ کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پہ ہوتا ہے۔ افغانستان کے رہنے

والے افغانی اور ایران کے رہنے والے ایرانی کہلاتے جاتے ہیں۔ غرض قدیم زمانوں سے قوم کا لفظ ملک کے باشندوں کے لیے بولا جاتا ہے چاہے ان میں بعض خصوصیات ایک دوسرے سے مختلف ہوں۔ یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو، مسلمان، عیسائی جو اس ملک میں رہتے ہیں سب ایک قوم ہیں۔ البتہ اردو ہندی تنازعہ ۱۸۶۷ء کے بعد وہ اس حقیقت کا ادراک کر چکے تھے کہ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کا یکجا رہنا ناممکن ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر سر سید کو دوقومی نظریے کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ محمد امین زبیری لکھتے ہیں:

''اگر سرسید ابتدا میں ہی دوقومی نظریہ کو سامنے نہ لاتے اور ہندوقومیت میں جذب ہونے کو نہ روکتے تو آج سیاسی حیثیت میں مسلمانوں کا مقبرہ بن چکا ہوتا۔''[۴۰]

رئیس احمد جعفری بھی سرسید کو دوقومی نظریے کا خالق قرار دیتے ہیں۔ وہ اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

''دوقومی نظریے کے اصل خالق سرسید احمد خاں تھے۔ انھوں نے بار بار اپنی تقریروں اور بیانات میں اعلان کیا کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں اور وہ اپنی انفرادیت چاہتے ہیں۔ دراصل پاکستان کی ''خشتِ اوّل'' یہی تھی۔''[۴۱]

رئیس احمد جعفری کے علاوہ اور بھی کئی لکھنے والوں نے سرسید احمد خاں کو دوقومی نظریے کا بانی قرار دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے انگریزوں کے متعارف کرائے ہوئے اصول انتخاب کی بات کی اور مسلمانوں کی الگ سیاسی تنظیم کی بنیاد رکھی۔ اس حوالے سے مشیر مخدومی فیروز پوری کا کہنا ہے:

''سرسید ہی تھا جس نے سب سے پہلے مسلمان کی انفرادیت کو ہندو کی دستبرد سے بچانے کے لیے ۱۸۳۳ء میں گورنر جنرل کی کونسل میں سی۔ پی لوکل سیلف گورنمنٹ بل پر بحث کرتے ہوئے اس اصولِ انتخاب کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی تنظیم کی بنیاد رکھی تاکہ کسی وقت مسلمان ہندو میں جذب ہو کے نہ رہ جائے....... یہ ''پہلی آواز'' تھی جو ۱۸۳۳ء میں سرسید نے اپنی قوم کی جداگانہ سیاسی تنظیم

کے لیے اس کے حقِ انفرادیت کے شیشہ کو ہندو کی متحدہ قومیت کے پتھر کی ضرب سے بچانے کے لیے اٹھائی۔''[42]

ضیاء الدین لاہوری نے سرسید کے اصل بیانات اور تحریروں کے اقتباسات پیش کیے، سرسید کو ان کے اصل نظریات سمیت قوم کے سامنے پیش کر دیا۔ انھوں نے سرسید کے حوالے سے رائج عام تصورات و نظریات پر تحقیق کی اور اصل صورتحال قوم کے سامنے پیش کی۔

عام خیال یہ ہے کہ علی گڑھ کالج کا قیام دوقومی نظریے کا سرچشمہ ہے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ یہ کالج صرف مسلمانوں کی تعلیم کے لیے بنایا گیا تھا۔ ضیاء الدین لاہوری کا خیال ہے کہ حقائق اس سے مختلف ہیں، مدرستہ العلوم علی گڑھ صرف مسلمانوں کا تعلیمی ادارہ نہ تھا وہاں ہندو طالب علم بھی زیرِ تعلیم تھے۔ سرسید نے خود کئی موقعوں پر اس بات کی وضاحت کی کہ یہ ادارہ ہندو اور مسلمان دونوں کی تعلیمی ترقی کے لیے ہے، اور وہ تربیت جو ہندوستان میں مقصود ہے وہ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو دی جاتی ہے۔ سرسید نے ایک اور موقع پر اس حوالے سے کہا کہ ہندوؤں کی ذلت مسلمانوں کی ذلت ہے اور مسلمانوں کی ذلت ہندوؤں کی ذلت ہے۔ جب تک ایک طرح کے وسائل ترقی دونوں قوموں کے لیے مہیا نہ کیے جائے گے، ہماری ترقی نہیں ہو سکتی۔ وہ انگریزی حکومت اور ان کے محکوموں (ہندو اور مسلمان) کے درمیان اچھے تعلقات چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندو مسلم اتحاد ہی اس ملک کے باشندوں کے لیے راہِ نجات ہے۔ انھوں نے اس اتحاد کے لیے کوششیں بھی کیں جو بار آور نہ ہوئیں۔ علی گڑھ کالج میں بھی انھوں نے ہندو مسلم میں کوئی امتیاز نہ رکھا۔ سرسید نے اس حوالے سے کہا:

''مجھ کو افسوس ہو گا اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ یہ کالج ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز ظاہر کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا ہے ... میں اس بات کے بیان کرنے سے خوش ہوں کہ اس کالج میں دونوں بھائی ایک ہی سی تعلیم پاتے ہیں۔ کالج کے تمام حقوق، جو اُس شخص سے متعلق ہیں جو اپنے تئیں مسلمان کہتا ہے، بلا کسی قید اس شخص سے بھی متعلق ہیں جو اپنے تئیں ہندو بیان کرتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے

درمیان ذرا بھی امتیاز نہیں ہے۔صرف وہی شخص انعام کا دعویٰ کر سکتا ہے
جو اپنی سعی و کوشش سے اُس کو حاصل کرے۔ اِس کالج میں ہندو اور
مسلمان دونوں برابر وظیفوں کے مستحق ہیں اور دونوں کی نسبت بطور بورڈر
کے یکساں طور پر سلوک کیا جاتا ہے۔'' [۴۳]

سرسید اپنی عمر کے آخری لمحات تک ہندو مسلم اتحاد کے داعی رہے۔انھوں نے ایک ہی سرزمین پر رہنے والوں کو ہمیشہ ایک ہی قوم قرار دیا۔ان کی وفات سے چند ماہ قبل شائع ہونے والی ان کی ایک تحریر بھی ان کے متحدہ قومیت کے نظریے کی عکاس ہے۔وہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں لکھتے ہیں:

''صدیاں گزر گئیں کہ ہم دونوں ایک ہی زمین پر رہتے ہیں۔ ایک ہی
زمین کی پیداوار کھاتے ہیں، ایک ہی زمین کے دریا کا پانی پیتے ہیں،
ایک ہی ملک کی ہوا کھا کر جیتے ہیں، پس مسلمانوں اور ہندوؤں میں کچھ
مغائرت نہیں ہے۔جس طرح آریا قوم کے لوگ ہندو کہلائے جاتے
ہیں اُسی طرح مسلمان بھی ہندو، یعنی ہندوستان کے رہنے والے کہلائے
جا سکتے ہیں۔'' [۴۴]

ضیاءالدین لاہوری کے خیال میں جو صاحبان سرسید کو دوقومی نظریے کا بانی قرار دیتے ہیں انھیں ان حقائق پر غور کرنے کی اشد ضرورت ہے۔اس حوالے سے ضیاءالدین لاہوری رقم طراز ہیں:

''سرسید کو آزادی ہند کے مجاہدوں میں شمار کرنے والے اور اُن کی
''جدوجہد'' کو دوقومی نظریے کی بنیاد پر قائم ہونے والے ملک پاکستان
کا ثمرہ قرار دینے والوں کو اُن کے ''فرمودات'' پر ٹھنڈے دل سے غور
کرنا چاہیے۔'' [۴۵]

ہمارے بہت سے قلم کار دوقومی نظریے کو سرسید سے منسوب کرتے ہیں حالانکہ سرسید ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار رہے اور قوم کی بنیاد وطن کو قرار دیتے رہے۔سرسید کے نظریہ قومیت کا اگر قائداعظم کے نظریہ قومیت سے موازنہ وتقابل کیا جائے تو بات سمجھ میں آجاتی ہے۔کہ دوقومی

نظریہ کیا ہے؟ دونوں نظریات میں کیا فرق ہے۔ قائداعظم نے گاندھی کے نام نظریہ قومیت کے حوالے سے ایک خط میں ۱۷ستمبر۱۹۴۴ءکو لکھا تھا:

''ہمارا دعویٰ ہے کہ قومیت کی ہر تعریف اور معیار کی رو سے مسلمان اور ہندو دو بڑی قومیں ہیں۔ ہماری قوم دس کروڑ انسانوں پر مشتمل ہے اور مزید برآں یہ کہ ہم ایک ایسی قوم ہیں جو اپنے خاص تہذیب وتمدن، زبان و ادب، فنون وتعمیرات ، رسم واصلاحات، معیار قدر تناسب ،تشریعی قوانین، ضوابط اخلاق، رسم ورواج، نظام تقویم ،تاریخ وروایات اور رجحانات وعزائم رکھتی ہے۔ غرض یہ ہے کہ ہمارا ایک خاص نظریہ حیات ہے اور زندگی کے متعلق ہم ایک ممتاز تصور رکھتے ہیں۔ بین الاقوامی قانون کے تمام اصولوں کے مطابق ہم ایک قوم ہیں۔''[۴۶]

قائداعظم کا بیان اس وقت کے تناظر میں دیکھا جائے تو انگریز حکومت دوسری جنگ عظیم میں مبتلا تھی۔ پاکستان کا نام تجویز ہو چکا تھا۔ قرارداد پاکستان منظور ہو چکی تھی اور الگ وطن کا حصول قریب تھا۔ سرسید کے پیش نظر اس خطے کے لوگوں کی فلاح وترقی تھی تاہم ان کو بخوبی اندازہ تھا کہ ہندو مسلمانوں کے خیر خواہ نہیں ہو سکتے اس لیے انھوں نے کانگرس کے مقابلے میں الگ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کی اور اردو ہندی تنازعہ کے بعد تو سرسید مایوس ہو گئے۔ قائداعظم کی طرح واشگاف الفاظ میں انھوں نے نہیں کہا البتہ وہ ہندو اور مسلمانوں کو الگ اقوام تصور کرتے تھے اور حکومت سے مفادات کی خاطر دونوں کے اتحاد کے قائل تھے۔ تاہم برصغیر پاک وہند کے بہت سے ایسے قلم کار بھی ہیں جنھوں نے اس بات کا اظہار کیا کہ سرسید دوقومی نظریے کے بانی نہیں تھے بلکہ وہ متحدہ قومیت کے علمبردار تھے۔ اس حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر خلیق نظامی نے کہا ہے:

''سرسید کی فکر کا ایک نہایت ہی اہم پہلو اُن کا تصورِ قومیت ہے۔ انھوں نے دو بنیادی حقیقتوں کو اس سلسلے میں بار بار دہرایا ہے۔ ایک یہ کہ قوم مذہب سے نہیں بنتی، دوسرے یہ کہ ہندوستان میں بسنے والے سب ایک قوم ہیں۔''[۴۷]

سرسید کے نظریہ قومیت کے حوالے سے آلِ احمد سرور نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے کہ سرسید متحدہ قومیت کا تصور رکھتے تھے نہ کہ مذہب کی بنیاد پر دو قوموں کا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''سرسید مذہب کی بنا پر قومیت کا تصور نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے ''قوم'' کا لفظ کسی برادری یا مذہبی برادری کے لیے بھی استعمال کیا ہے مگر اس سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے ——— جہاں ''نیشن'' کا لفظ سرسید استعمال کرتے ہیں وہاں ساری ہندوستانی قوم مراد ہے۔''[۴۸]

سرسید نے نہ تو کبھی مذہب کی بنیاد پر قومیت کے تصور پر بات کی، نہ کبھی فرقہ ورانہ تقاریر کیں، نہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف اکسایا، نہ ملک کی تقسیم کی بات کی، نہ مسلمانوں کے لیے ملازمتوں میں حصہ مانگا اور نہ ہی جداگانہ انتخابات کے حوالے سے کوئی بات کی۔

سرسید کے نظریہ قومیت کے حوالے سے دوسرے بہت سے اہل قلم نے بھی اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ پروفیسر شان محمد نے اس حوالے سے مفصل بحث کی ہے۔ انھوں نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے کہ سرسید کا دو قومی نظریے اور تقسیم ہند سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کے بقول ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کی آمد اور بعد ازاں قائد اعظم محمد علی جناح کے چودہ نکات کی آمد تک کسی نے بھی علی گڑھ تحریک کو دو قومی نظریے اور انھیں پاکستان کا محرک قرار نہیں دیا تھا۔ پروفیسر شان محمد رقمطراز ہیں:

> ''سرسید کی درجنوں تقاریر ہیں جن میں انھوں نے ہندو اور مسلمانوں کو ایک ہی قوم تصور کیا۔ انھوں نے نہ تو فرقہ وارانہ تقاریر کیں، نہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف اکسایا اور نہ ملک کے بٹوارے کی بات کی اور نہ مسلمانوں کے لیے سروس میں ریزرویشن مانگا اور نہ انتخاب جداگانہ کو ہوا دی بلکہ اس بات کی نصیحت کرتے رہے کہ مسلمان اپنے اندر صلاحیت پیدا کریں تاکہ وہ ملک کو ترقی کی راہوں پر لے جائیں۔''[۴۹]

پروفیسر جمال خواجہ نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے سرسید کو دو قومی نظریے کا بانی اور برصغیر میں الگ اسلامی ریاست کے خیال کا موجد قرار دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہندوستانی سیاست میں سرسید کو مسلم علیحدگی پسندی کے مورثِ اعلیٰ کے

طور پر پیش کرنا اُن کے تاریخی مرتبے کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ یہ اور بھی
زیادہ ستم ظریفی کی بات ہے اگر ہم سر سید کو ہندوستان میں ایک خالص
اسلامی مملکت کے خیال کا موجد قرار دیں۔''[۵۰]

پروفیسر جمال خواجہ کا بیان حقائق پر مبنی نہیں ہے کیونکہ الگ ریاست کا قیام اور دوقومی نظریہ الگ الگ مبحث ہیں۔ اس دور میں انگریزی حکومت کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ الگ ریاست کی بات کرنا عبث تھا اور ایسے حالات میں تصور کرنا بھی محال تھا۔ البتہ وقتی تقاضوں کے مطابق ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت تھی۔ سر سید نے حکومت کے ساتھ تعلقات اور مفادات کے پیش نظر ہندو مسلم اتحاد کی بات کی۔

امین زبیری نے تذکرۂ سر سید میں **تہذیب الاخلاق** کے اغراض ومقاصد بیان کرنے کے ساتھ ساتھ سر سید کو دوقومی نظریے کا حامی قرار دیا اور اس حوالے سے رسالہ اسباب بغاوتِ ہند کی خدمات کو سراہا ہے وہ لکھتے ہیں:

''اس رسالہ میں جہاں اسباب بغاوت بیان کیے ہیں اور ان پر بحث کی وہاں
جا بجا ضمناً اس حقیقت کو بھی کہ اس ملک میں ہندو اور مسلمان دو جداگانہ
قومیں ہیں نمایاں کر دیا اور پھر مختلف مواقع پر تقریروں بیانوں اور تحریروں
میں اس حقیقت یا اس دوقومی نظریہ کو زیادہ مدلل اور زوردار طریقہ سے پیش
کرتے رہے۔ چنانچہ ۱۸۸۲ء میں جب کہ وہ امپریل کونسل کے ممبر تھے لوکل
سیلف گورنمنٹ کے بل پر بحث کے دوران میں نہایت صاف کر دیا انھوں
نے مسلم قومیت کی بنیاد مذہب اسلام کی سطح پر رکھی تھی پھر ایک بیان میں جو
رحلت سے ایک سال پہلے لکھا تھا اور صاف کہا کہ ''مسلمانوں میں ایک
مدت دراز سے بہ لحاظ نسل اور ملک کے ایک قوم ہونے کا اطلاق بہت کم ہو گیا
ہے بلکہ صرف مسلمان ہونا قومیت کی علامت ہو گیا ہے اور کُلِ مومنٍ اِخوۃ کا
خیال تمام ملک کے مسلمانوں کو ایک قوم بناتا ہے۔''[۵۱]

ان تمام ناقدین اور مفکرین کی رائے جان لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ۱۸۶۸ء کے اردو ہندی تنازعے کے بعد سر سید کے ہاں یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے

الگ کمیونٹی خیال کرتے تھے۔ اس سے مولانا حالی اور مابعد کے ناقدین نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ دوقومی نظریے کے حامی ہیں یہ تعبیر اپنی جگہ وزن رکھتی ہے۔ سرسید نے اپنے دورۂ لاہور کے موقع پر آریہ سماج کے وفد سے گفتگو کرتے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان وحدت پر جس طرح زور دیا اس سے دوقومی نظریے کی نفی کا پہلو ابھرتا ہے اب دو ہی صورتیں ہیں کہ یا تو ان کے ۱۸۶۷ء کے خیالات کو ان کے اصلی خیالات مان لیا جائے اور دورۂ لاہور ۱۸۸۴ء کے موقعے کی گفتگو کی تاویل کر لی جائے یا دورۂ لاہور کی گفتگو کو ان کے اصل خیالات مان لیے جائیں اور ۱۸۶۷ء کے خیالات کو وقتی ناراضی ٹھہرایا جائے۔ سرسید کے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے ان کی کچھ اور تقاریر بھی ملتی ہیں جن سے دوقومی نظریے کا تاثر ابھرتا ہے اس لیے دوٹوک لفظوں میں یہ کہنا مشکل ہے کہ سرسید احمد خاں دوقومی نظریے کے مخالف تھے۔ ضیاء الدین لاہوری کے اخذ کردہ نتائج کو ہم ضرورت سے زیادہ سادہ بیانی اور صحافیانہ انداز قرار دے سکتے ہیں۔ یہ انداز بہ ہر حال تحقیق کے معیار سے فروتر ہے۔

سرسید احمد خاں کی شخصیت اور ان کارناموں کے بیان میں ہمارے قلم کاروں میں اعتدال کے رویے کا بہت فقدان رہا۔ اہلِ قلم کے ایک طبقے نے تو سرسید کی تعریف وتوصیف میں حد درجہ جانبداری سے کام لے کر حسین وجمیل، خوبصورت اور بھاری بھرکم الفاظ استعمال کر کے ان کے ہر کام کی عظمت ورفعت بیان کر کے ان کی شخصیت اور کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جبکہ اہل قلم کے ایک دوسرے طبقے نے سرسید کی شخصی خامیوں اور ان کی پالیسیوں کو خوب ہدفِ تنقید بنایا اور ان کے اچھے کاموں کو بھی شک کی نگاہوں سے دیکھا۔

مبالغے اور مغالطے

سرسید بھی ایک انسان تھے، ان سے کئی ایک فروگذاشتیں ہوئیں، انھوں نے بھی بہت سی عظیم ہستیوں کے خیالات وافکار سے اختلاف کیا لیکن سرسید کے حامیوں نے سرسید کی ذات کو اس طرح پیش کیا کہ جیسے وہ بالکل خطاؤں سے پاک اور معصوم تھے۔ سرسید کے قریب ترین ساتھی بھی بہت سی باتوں میں ان سے اختلاف رکھتے تھے اور اس کا کھل کر اظہار بھی کرتے تھے۔ نواب محسن الملک کا اس حوالے سے بیان ہے:

''سید صاحب نے کبھی دعویٰ پیغمبری نہیں کیا اور نہ اس بات پر اقرار کہ خواہ

مخواہ لوگ ان کے ہم عقیدہ ہوں، لہٰذا اصلی اور سچی بات کو ہم تسلیم کرتے رہے اور ان کی بری بات کو نہ مانتے تھے اور صاف ان کے روبرو انکار کر دیتے تھے۔'' [۵۲]

نواب محسن الملک نے اس حوالے سے یہ بھی کہا کہ سرسید کا مجھ سے زیادہ جاننے والا اور کوئی نہیں، مجھ سے زیادہ عقیدت مند بھی کوئی اور سرسید کا نہ ہوگا مگر میں بھی یہ بات سمجھتا ہوں کہ سرسید کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا تھا کیونکہ ان کی رائے قرآن وحدیث کے مثل نہ تھی، ان کی گفتگو وحی آسمانی نہ تھی لہٰذا ان کے خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے نواب محسن الملک لکھتے ہیں:

''اگرچہ یہ سچ ہے کہ سرسید نہایت عالی دماغ اور دُور اندیش مدّبر تھے اور شب وروز قومی ترقی کے خیالات میں مستغرق ومنہمک رہتے تھے، وہ جو رائے قائم کرتے بعد غور کامل کے، جو خیالات ظاہر کرتے اس کے ہر پہلو پر گہری نظر ڈالتے اور اس وجہ سے کوئی دانشمند شخص یکا یک سرسید کے خیالات سے اختلاف نہیں کر سکتا لیکن زمانہ کی حالت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے، اقتضائے زمانہ ہمیشہ دانشمندوں کو اپنے واجب الاحترام بزرگوں کی رائے سے اختلاف کرنے اور جدید تجاویز پیش کرنے کو مجبور کرتا ہے'' [۵۳]

درج بالا بیان سے ظاہر ہے کہ سرسید کے حامیوں اور مخالفوں نے ''ان کے اقوال و افعال کی روشنی'' میں جائزہ نہیں لیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ سنین وار ان کے خیالات ونظریات میں ارتقا کو پیش کیا جاتا، ان کے افکار ونظریات کے ادوار متعین کیے جاتے جس سے معلوم ہوتا کہ ان کا کونسا بیان کب کا ہے اور کب اس میں تبدیلی آئی اور کیوں؟ یہ کام ہنوز باقی ہے۔

اس حوالے سے ضیاء الدین لاہوری لکھتے ہیں:

''ہمارے دانشور ہمیں آج تک تصویر کا صرف ایک ہی رخ دکھاتے چلے آرہے ہیں جو ہمارے ذہنوں میں اس قدر سمویا جا چکا ہے کہ جب ہمیں اس کے ساتھ اس کا دوسرا رخ بھی دکھانے کی کوشش کی جائے تو ذہن قبول نہیں کرتا۔...... دیانت داری کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی شخصیتوں کے

صحیح مقام کا تعین ان کے اقوال وافعال کی روشنی میں کریں اور جذباتی انشا
پردازی کے زور سے اپنی مرضی کے مطابق ان کی تصویریں بنانے یا
بگاڑنے سے احتراز کریں۔''[۵۴]

سرسید احمد خاں کا شمار ہندوستان کی سحر انگیز اور انقلابی شخصیات میں ہوتا ہے ان کے اندر بے پناہ صلاحیتیں تھیں۔ تحریر وتقریر پر ان کو عبور تھا یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایک زمانے کو متاثر کیا اور آج بھی ان کی شخصیت علمی مجالس میں زیرِ بحث رہتی ہے۔ سرسید کی شخصیت کی تشکیل جس ماحول میں ہوئی اس کا جائزہ لیا جانا بھی ضروری ہے تاکہ ہم یہ دیکھ سکیں کہ سرسید کی شخصیت کس طرح تشکیل پذیر ہوئی۔

راست بازی اور سچائی بھی سرسید کی عادت میں شامل تھی۔ سرسید نے اپنے حالاتِ زندگی بیان کرتے وقت کبھی اپنے آپ کو پارسا ثابت کرنے کے لیے جھوٹ کا سہارا نہیں لیا۔ انھوں نے اپنی جوانی جس انداز میں گزاری اسے بالکل سچ سچ بیان کر دیا۔

ضیاء الدین لاہوری کا خیال ہے کہ سرسید پر لکھنے والے بہت سے قلم کاروں نے سرسید کی ذات اور ان کے کارناموں پر لکھتے وقت حقائق سے روگردانی کی ہے۔ ہمارے بہت سے مفکر، دانش ور، صحافی اور اساتذہ سرسید کے افکار ونظریات کا مکمل طور پر مطالعہ کے بغیر ان پر گفتگو کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ سرسید کا محض ایک ہی رخ پیش کر پاتے ہیں جس سے سرسید کی اصل شخصیت دب کر رہ جاتی ہے اور ان کی شخصیت کا اصل رنگ قارئین کے سامنے نہیں آتا۔ بہت سے دانشور اصل کتب کا مطالعہ کیے بغیر لکھتے اور بولتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنے خیالات کو خوبصورت الفاظ میں ملفوف کر کے پیش کرتے ہیں اور حقائق کو جاننے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ سرسید کے مدح خوانوں نے حقائق پر غور کیے بغیر محض تخیل کے زور پر وہ بلند پروازیاں کی ہیں کہ حقائق سے روگردانی کی مثال قائم کر دی ہے۔ سرسید احمد خاں کے بہی خواہوں نے جو مدح سرائی کی ہے اس کے چند نمونے ضیاء الدین لاہوری نے پیش کیے ہیں ملاحظہ ہوں

''سرسید نہ ہوتے تو نہ علی گڑھ ہوتا....... نہ اقبال کے خواب کی تعبیر
حقیقت بنتی اور نہ جناح کو پاکستان کے معمار اور افواج پاکستان کے قائد
ملتے۔ یہ سرسید علیہ الرحمہ ہی کا طفیل ہے کہ پاکستان کے وجود کو قائم رکھنے

کے لیے لیاقت (علی خاں) اور اسے استحکام بخشنے کے لیے (جنرل)
ایوب جیسا فرزندِ قوم علی گڑھ سے مل گئے۔"[۵۵]

محمود علی خاں صاحب نے جو کچھ لکھا تخیّل کی بلند پروازی کے ساتھ ساتھ کسی حد تک حقیقت بھی ہے کیونکہ علی گڑھ کی اصل خدمت انگریزی تعلیم کو عام کرنا ہے اور قیامِ پاکستان کے لیے کوشش کرنے والے (علامہ اقبالؒ قائداعظمؒ ظفر علی خاں وغیرہ اور بعدازاں لیاقت علی) انگریزی خواں طبقے سے تعلق رکھنے والے تھے۔ صفدر سلیمی لکھتے ہیں:

"اگر سرسید کا یہ شاہکار (مدرستہ العلوم) سامنے نہ آتا تو اس ملک کی فضاؤں میں نہ محمد علی جوہر اور ظفر علی خاں کے نعرہ ہائے حُریت سنائی دیتے، نہ اقبال کے حیات آفریں نغموں کی گونج فردوسِ گوش بنتی اور نہ وہ قائداعظمؒ میدانِ قیادت میں نظر آتا جس کا تدبر برطانوی سامراج اور ہندو سامراج کے لیے ملک الموت ثابت ہوا اور مسلمانوں کے لیے ایک عظیم مملکت کا نقطۂ آغاز۔"[۵۶]

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے بھی سرسید کے حوالے سے تخیّل کے زور پر ایک خوبصورت تحریر لکھ دی۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری لکھتے ہیں:

"اگر سرسید مذہبی اصلاح کا کام انجام نہ دیتے تو سائنس کی تیز روشنی میں باطل تصورات کے دیے جھلملا کر ماند پڑ جاتے۔ یہ تصورات اسلام سے وابستہ سمجھے جاتے تھے اس لیے سائنس کے مقابلے میں یہ اسلام کی بہت بڑی شکست ہوتی۔"[۵۷]

ذاکر حسین فاروقی نے بھی کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اگر سرسید .... انگریزوں کے اس اشتعال کو، جو انقلاب ۵۷ء کے بعد پیدا ہو گیا تھا، وفا شعاری کے پانی سے نہ بجھا دیتے آج ہندوستان سے اسلام کا نام اسی طرح فنا ہو جاتا جس طرح سپین سے ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔"[۵۸]

سرسید کی مخالفت اور حمایت دونوں میں ہمیں مبالغہ نظر آتا ہے۔ ان کے عقیدت مند یہ

بھول گئے کہ ان سے بھی فروگزاشت ہوسکتی ہے۔اس حوالے سے پروفیسر خلیق احمد نظامی رقم طراز ہیں:

''ان کے زمانے میں کم ازکم ان کے عقیدت مند ان کے افکار وخیالات کی غلط تفسیر وتعبیر نہیں کرتے تھے۔آج ایک مخصوص مکتب خیال سے تعلق رکھنے والے عقیدت مندوں کا طبقہ ان سے وہ تصورات منسوب کرتا ہے جن کی پرچھائیاں بھی ان کے حاشیہ خیال پر نہیں پڑتی تھیں۔جو غلط فہمی عقیدت مندی کے سہارے پھیلائی جاتی ہے،اس کا دور کرنا مخالفوں کی بدظنی کا مقابلہ کرنے سے زیادہ دشوار ہوتا ہے۔''[۵۹]

ان کی تحریروں کے حوالے سے ضیاءالدین لاہوری لکھتے ہیں:

''راقم یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کتابیں ہر شخص لکھ سکتا ہے مگر تحقیق میں مغز کھپانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔بغیر تحقیق کیے کتابیں لکھنے یا ایک مفروضہ کو فیصلہ کن انداز میں سامنے رکھ کر تحقیق کرنے سے وہ تضاد بیانی جنم لے گی ـــــ جس کے ذکر کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔''[۶۰]

ضیاءالدین لاہوری نے عمر بھر سرسید کی شخصیت اور ان کی تحریروں پر تحقیق کی۔ان کا کہنا ہے کہ سرسید کو آج تک اس طرح پیش نہیں کیا گیا جس طرح کہ پیش کیا جانا چاہیے تھا۔ان کے افکار وخیالات کو سیاق وسباق سے ہٹا کر پیش کیا جاتا رہا،سرسید کے حوالے سے لکھنے والے دو طبقے ہمیشہ موجود رہے ایک طبقہ وہ جس نے حمایت میں لکھا اور اعتدال کی حد کو برقرار نہ رکھا،دوسرا طبقہ وہ جس نے مخالفت میں لکھا اور اعتدال کو قائم رکھنے میں کامیاب نہ ہوا۔دونوں طبقوں کا رویہ نا مناسب تھا۔ضرورت اس امر کی تھی کہ سرسید کی شخصیت کا جائزہ ان کے افکار وخیالات کی روشنی میں لیا جاتا اور ان کو اُسی طرح پیش کیا جاتا جیسا کہ وہ تھے۔ضیاءالدین لاہوری نے تحقیق کر کے سرسید کے اصل خیالات اور ان کے حق اور مخالفت میں لکھے گئے مواد کو یکجا کر دیا ہے اور فیصلہ قاری کی ذات پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ ان حقائق کے مطالعے کے بعد کیا رائے قائم کرتا ہے۔ضیاءالدین لاہوری نے جو بھی بات کی ہے وہ سند اور حوالے کے ساتھ کی ہے۔یوں ان کا تحقیقی رویہ قابلِ داد اور قابلِ توجہ ٹھہرتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ضیاءالدین لاہوری، نقشِ سر سید، لاہور، جمعیۃ پبلیکیشنز: ۲۰۰۶ء، ص ۱۱

۲۔ ایضاً، ص ۲۰

۳۔ مولانا الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، کانپور، نامی پریس: ۱۹۰۱ء، ص ۲۹۵

۴۔ نواب محسن الملک، مجموعہ لیکچرز واسپیچز، لاہور، نول کشور گیس پرنٹنگ ورکس پریس: ۱۹۰۴ء، ص ۵۰۸

۵۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، سر سید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر، لاہور، مکتبہ کارواں: ۱۹۶۰ء، ص ۲۶

۶۔ محمد اکرام شیخ، موجِ کوثر، لاہور، مرکنٹائل پریس: ۱۹۴۰ء، ص ۵۱

۷۔ علی بخش خاں، سیلیکٹڈ ڈاکومنٹس فرام دی علی گڑھ آرکائیوز (مرتبہ یوسف حسن) علی گڑھ، یونیورسٹی پریس: ۱۹۶۶ء، ص ۲۱۴

۸۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، نگار، کراچی: اکبرالہ آبادی نمبر، ۱۹۶۹ء ص ۱۲۷

۹۔ مولانا الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، حصہ اول، ص ۲۲۲

۱۰۔ ڈاکٹر خیال امروہوی، سپوتنک ڈائجسٹ، لاہور: جنوری ۱۹۹۵ء، ص ۳۳

۱۱۔ ضیاءالدین لاہوری، خودنوشت افکارِ سر سید، لاہور، جمعیۃ پبلی کیشنز: ۲۰۱۰ء، ص ۱۹۹

۱۲۔ ضیاءالدین لاہوری، آثار سر سید، لاہور، جمعیۃ پبلی کیشنز: ۲۰۰۷ء، ص ۲۸۱

۱۳۔ لارڈ میکالے، میکالے کا نظریہ تعلیم (ترجمہ عبدالمجید صدیقی) کراچی، روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی: ۱۹۶۵ء، ص ۶۷

۱۴۔ سرسید احمد خاں، مقالاتِ سر سید، مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی، لاہور، مجلس ترقی ادب: (جلد ہشتم) ۱۹۶۲ء، ص ۳۶

۱۵۔ ڈاکٹر زاہد منیر عامر، تاریخ جامعہ پنجاب جلد دوم، لاہور: پنجاب یونیورسٹی ۲۰۰۴ء، ص ۳۲

۱۶۔ مولانا الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، حصہ دوم، ص ۸۶۔۸۵

۱۷۔ سرسید احمد خاں، مجموعہ لیکچرز و اسپیچز، (مرتبہ محمد امام الدین گجراتی)، لاہور، مصطفائی پریس: ۱۹۰۰ء، ص ۴۳۰

۱۸۔ ایضاً، ص ۴۷۵

۱۹۔ سرسید احمد خاں، سفرنامہ پنجاب، (مرتبہ سید اقبال علی) علی گڑھ، انسٹی ٹیوٹ پریس: ۱۸۸۴ء، ص ۲۵

۲۰۔ سرسید احمد خاں، مجموعہ لیکچرز و اسپیچز، ص ۳۸۴

۲۱۔ ضیاء الدین لاہوری، **نقش** سر سید، لاہور، جمعیۃ پبلیکیشنز: ۲۰۰۷ء، ص ۹۸

۲۲۔ ایضاً، ص ۹۵

۲۳۔ ایضاً، ص ۹۵

۲۴۔ ایضاً، ص ۹۴

۲۵۔ الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، حصہ دوم، ص ۸۴

۲۶۔ صفدر سلیمی، پاکستان کا معمار اول، لاہور، ادارہ طلوع اسلام: ۱۹۶۷ء، ص ۱۷

۲۷۔ ریاض الرحمٰن شیروانی، کانفرنس گزٹ علی گڑھ، اکتوبر ۲۰۰۵ء، ص ۱۵

۲۸۔ ضیاء الدین لاہوری، نقش سر سید، ص ۱۰۶

۲۹۔ سرسید احمد خاں، مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز، ص ۱۵۲

۳۰۔ سرسید احمد خان ایجوکیشنل فلاسفی (مرتبہ: حفیظ ملک) اسلام آباد، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ کلچرل ریسرچ: ۱۹۸۹ء، ص ۱۴۹

۳۱۔ سرسید احمد خاں، مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز، ص ۳۴۶

۳۲۔ ڈاکٹر فوق کریمی (مرتب) سر سید کے سیاسی افکار، لاہور، ایشیا بک سنٹر: ۱۹۹۰ء، ص ۲۴۳

۳۳۔ ضیاءالدین لاہوری، نقشِ سر سید، ص۲۲۱
۳۴۔ ایضاً، ص۲۲۵
۳۵۔ ایضاً،
۳۶۔ ایضاً، ص۲۲۳
۳۷۔ سرسید احمد خاں، خطباتِ سر سید، جلد دوم (مرتبہ، شیخ اسماعیل پانی پتی)، ص۵۱۲
۳۸۔ سرسید احمد خاں، سفر نامہ پنجاب، ص۱۶۷
۳۹۔ ایضاً، ص۱۳۹، ۱۴۳
۴۰۔ محمد امین زبیری، تذکرہ سر سید، لاہور، یونائیٹڈ پبلیکیشنز: ۱۹۶۱، ص۲۳۱
۴۱۔ رئیس احمد جعفری، خطباتِ قائداعظم، لاہور، شعاعِ ادب: ۱۹۶۱ء
۴۲۔ مشیر مخدومی فیروز پوری، پاکستان کی طرف، لاہور، یونائیٹڈ پبلیکیشنز: ۱۹۴۷ء، ص۵۸۔۵۷
۴۳۔ سرسید احمد خاں، سفر نامہ پنجاب، ص۱۶۶
۴۴۔ سرسید احمد خاں، آخری مضامین (مرتبہ امام الدین گجراتی) لاہور، رفاہِ عام پریس: ۱۸۹۸ء، ص۵۵
۴۵۔ ضیاءالدین لاہوری، نقشِ سر سید، ص۲۵۱
۴۶۔ محمد علی جناح، بحوالہ آثارِ سر سید، ضیاءالدین لاہوری، ص۲۱۲
۴۷۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی، سر سید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند: ۱۹۹۳ء، ص۳۹
۴۸۔ آلِ احمد سرور، فکر روشن علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس: ۱۹۹۵ء، ص۶۵
۴۹۔ پروفیسر شان محمد، سر سید تاریخی وسیاسی آئینہ میں، دہلی، یونین پرنٹنگ پریس: س ن، ص۱۰۴
۵۰۔ پروفیسر جمال خواجہ، فکر ونظر، علی گڑھ: اکتوبر ۱۹۹۲ء ص۱۵۱
۵۱۔ مولوی محمد امین زبیری، تذکرہ سر سید، لاہور، پبلیکیشنز یونائیٹڈ لمیٹڈ: ۱۹۶۴ء، ص۱۵۱

۵۲۔ محسن الملک، مجموعہ لیکچرز و اسپیچز، ص۴۱۲
۵۳۔ ایضاً
۵۴۔ ضیاء الدین لاہوری، نقشِ سر سید، ص۲۹۰
۵۵۔ محمود علی خاں، بحوالہ آثارِ سر سید، ضیاء الدین لاہوری، ص۲۶۷
۵۶۔ صفدر سلیمی، پاکستان کا معمار اول، ص۱۷
۵۷۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری، برگ گل، سر سید نمبر ۶۹، ۱۹۶۸ء، ص۲۹۸
۵۸۔ ذاکر حسین فاروقی، مسلم لیگ کیوں، بمبئی، مکتبہ سلطانی: ۱۹۴۷ء، ص۱۵
۵۹۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی، ساحل، کراچی: جون ۱۹۸۸ء ص۴۰
۶۰۔ ضیاء الدین لاہوری، آثار سر سید، ص۳۳

باب سوم

ضیاء الدین لاہوری کی سرسید شناسی

سرسید احمد خاں کا نام ہندوستان کی تاریخ کا اہم ترین نام ہے۔ ہندوستان کی شاید ہی کوئی اور شخصیت ایسی ہو جس کے حق اور مخالفت میں اتنا لکھا گیا ہو جتنا سرسید احمد خاں کے حوالے سے لکھا گیا۔ ان کے افکار و نظریات کی حمایت میں لکھنے والوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت اور ان کے افکار و نظریات کی مخالفت میں لکھنے والوں کی تعداد بھی کم نہیں۔

سرسید احمد خاں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے نتیجے میں ہونے والی تباہی اور بربادی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا۔ مسلمانوں کے زوال پر وہ رنجیدہ خاطر تھے۔ ان حالات میں انھوں نے مسلمانانِ ہند کی اصلاح و ترقی کا بیڑہ اٹھایا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک طرف تو رسالہ **تہذیب الاخلاق** جاری کیا جبکہ دوسری طرف علی گڑھ سکول اور کالج قائم کیے تا کہ مسلم نوجوانوں کو جدید تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جا سکے اور مسلمانوں اور انگریزی حکومت کے درمیان فاصلوں کو کم کیا جا سکے اور ان کے اور انگریزی حکومت کے درمیان باہمی اعتماد کی فضا قائم ہو اور ذہنی ہم آہنگی فروغ پا سکے۔

سرسید احمد خاں نے اس سلسلے میں اپنی تحریروں کے ذریعے مسلمانوں کی تعلیمی اور سیاسی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا۔ اردو نثر اور صحافت کے فروغ کے لیے بھی ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

سرسید احمد خاں کی شخصیت اس وقت متنازعہ بنی جب ان پر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران انگریزوں کا ساتھ دینے کا الزام آیا۔ بعدازاں ان کی سیاسی و مذہبی تحریریں بھی وجہ نزاع بنیں، خصوصاً ان کے مذہبی نظریات کو علما اور مسلم عوام نے پسند نہ کیا کیونکہ ان کے بہت سے نظریات اسلام کی بنیادی تعلیمات اور نظریات کے مطابق نہیں۔ سرسید کے ان نظریات کی وجہ

سے ان پر کفر کے فتوے بھی لگے۔ اسی دور میں جب سرسید نے علی گڑھ میں ایک ادارے کی بنیاد رکھی تو اس کے خلاف بھی ردعمل سامنے آیا، کیونکہ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اس ادارے میں مسلم نوجوانوں کو ویسی ہی تعلیم دی جائے گی جیسا کہ سرسید احمد خاں کے اپنے خیالات ونظریات ہیں۔

سرسید کے مذہبی نظریات جو ان کی مختلف تحریروں کی صورت میں سامنے آئے ان کے خلاف فوری ردعمل کی وجہ بنے۔ ہندوستان کے مسلمان دو طبقوں میں بٹ گئے، ایک طبقہ وہ تھا جو سرسید کے حق میں تھا اور دوسرا وہ جو ان کی مخالفت کر رہا تھا۔ ان کے حق اور مخالفت میں لکھنے کا سلسلہ سرسید کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔

قیام پاکستان کے بعد سرسید احمد خاں کی خدمات کا خوب چرچا ہوا۔ اس سلسلے میں مبالغہ آرائی بھی سامنے آئی۔ ضیاء الدین لاہوری نے اس پر تحقیق کا فیصلہ کیا تو انھوں نے سرسید کی اصل تحریروں کو تلاش کیا۔ انھوں نے لندن کے تمام بڑے کتب خانوں کے ریکارڈ کو دیکھا اور متعلقہ مواد اکٹھا کیا۔ تمام تحریروں کے بنظرِ عمیق مطالعے کے بعد انھوں نے حقائق کو قارئین کے سامنے رکھنے کے لیے معروضی طریقہ تحقیق کو اختیار کیا اور سرسید کے افکار ونظریات کو ان کی اپنی تحریروں کی روشنی میں پیش کیا۔ انھوں نے دوسرے محققین کی عینک سے دیکھنے کی بجائے اپنا معروضی اندازِ تحقیق اختیار کیا۔ انھوں نے حقائق کو من وعن پیش کر دیا اور نتائج کا استنباط قاری پر چھوڑ دیا۔ ان کی متعدد تصانیف اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ ان کتابوں میں سرسید کے اپنے خیالات بھی ہیں اور ان کی حمایت ومخالفت میں لکھنے والوں کے خیالات ونظریات بھی۔ انھوں نے تمام مواد کو قارئین کے سامنے پیش کر دیا تا کہ وہ حقائق جان کر کوئی فیصلہ کریں۔

سرسید کے حق میں لکھنے والے طبقے کی طرف سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ علما اور عوام کے ایک چھوٹے سے طبقے نے سرسید کی مخالفت اس بنا پر کی کہ وہ مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روشناس کرانا چاہتے تھے حالانکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ علما نے سرسید کی مخالفت ان کے مذہبی نظریات کی وجہ سے کی تھی نہ کہ علما جدید تعلیم کے مخالف تھے۔ اس حوالے سے ضیاء الدین لاہوری نے شیخ محمد اکرم کے نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔

> ''ان کی سب سے زیادہ مخالفت اس وقت ہوئی جب انھوں نے تہذیب الاخلاق جاری کیا اور ان مذہبی عقائد کا اظہار کیا جنھیں عام مسلمان

تعلیم اسلامی کے خلاف ملحدانہ سمجھتے تھے، مثلاً شیطان، اجنہ اور ملائک کے وجود سے انکار، حضرت عیسیٰؑ کے بن باپ پیدا ہونے یا زندہ آسمان پر جانے سے انکار، حضرت عیسیٰؑ و حضرت موسیٰؑ کے معجزات سے انکار وغیرہ وغیرہ۔ سرسید نے اپنے وقت کا بڑا حصہ ان عقائد و خیالات کی تفصیل میں صرف کیا ہے۔''[۱]

سرسید کے وہ نظریات جو تفسیر قرآن میں سامنے آئے وہ نظریات اسلام کے بنیادی تصورات سے متصادم تھے۔ سرسید کے انھی نظریات کی وجہ سے ہندوستان کے طول و عرض میں ان کی مخالفت ہوئی۔ اس مخالفت کی وجہ یہ نہیں تھی کہ سرسید انگریزی ملازمت کرتے تھے، انگریزوں سے تعلق اور میل جول رکھتے تھے، جدید تعلیم اور انگریزی زبان کو عام کرنا چاہتے تھے بلکہ وجہ ان کے مذہبی خیالات تھے کیونکہ علما اور مسلم دانش وروں کا خیال تھا کہ سرسید کے ادارے میں تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں کے عقائد بھی خراب ہو جائیں گے اور وہ اسلام کے بنیادی تصورات سے دور ہو جائیں گے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر خلیل الرحمٰن کے خیالات کو ضیاء الدین لاہوری نے پیش کیا ہے:

''سرسید کے وہ مخالفین جو مذہبی حیثیت سے سرسید کے مخالف تھے، ان کی مخالفت اس لیے نہیں تھی کہ سرسید ان انگریزوں کا ساتھ دیتے ہیں جو کوٹ پتلون پہنتے ہیں، کانٹے چھری سے کھاتے ہیں اور اپنے ساتھ ریل، تار، انجن، بجلی، مشین، بھاپ ہوٹل اور ہسپتال وغیرہ لے آئے ہیں بلکہ ان کی مخالفت کی ساری بنیاد سرسید کے مذہبی خیالات تھے جو قرآن و حدیث کی تفسیر کے بارے میں تھے۔ انھیں یہ ڈر تھا کہ کہیں سرسید قوم کو سدھارنے کی دھن میں مسلمانوں کا مذہب ہی نہ بدل دیں۔''[۲]

سرسید کے مذہبی خیالات سے ان کے رفقا نواب محسن الملک اور ڈپٹی نذیر احمد بھی متفق نہ تھے۔ ان لوگوں نے سرسید کے مذہبی نظریات کے حوالے سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار تحریری طور پر کیا۔ مولانا حالی بھی سرسید کے مذہبی خیالات سے متفق نہ تھے مگر اس کے باوجود وہ سرسید کی لکھی ہوئی تفسیر کو ایک نہایت جلیل القدر مذہبی تصنیف قرار دیتے تھے۔

مولانا حالی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے اور بھی بہت سے اہلِ قلم نے سرسید کے مذہبی نظریات کی تحسین کی ہے اور اسے روایتی تفاسیر، ملائیت اور بنیاد پرستی کے خلاف ایک موثر آواز قرار دیا ہے۔ بہت سے لکھنے والوں نے اس نکتے کا اظہار بھی کیا کہ سرسید نے **تفسیر قرآن** لکھ کر مسلمانوں کا علمی وقار بلند کرنے کی کوشش کی، مسلمانوں کو تعصّبات کی دلدل سے نکالا اور ان کے اندر سیکولر ذہن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر خیال امروہوی کے خیالات کو ضیاءالدین لاہوری نے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں:

> ''سرسید نے اپنے دور میں قرآن کی جدید انداز سے تفسیر کی اور طبقاتی اعتبار سے مسلمانوں کو انگریزوں اور ہندوؤں کے مقابل علمی اور نظریاتی طور پر اونچا کرنے کی عالمانہ کوشش کی، مجبور انسانوں کو مذہبی تعصّبات کی دلدل سے نکال کر سیکولر ذہن پیدا کرنے کے لیے تحریک چلائی۔ اس اعتبار سے بلاشبہ برصغیر پاک و ہند کے عوام سرسید کے احسانات کو ہرگز فراموش نہیں کر سکتے ہیں۔''[۳]

سرسید احمد خاں نے مروجہ تفاسیر کو ناقص قرار دیا اور مفسرین کی اغلاط کی نشاندہی کی۔ اسی طرح انھوں نے معجزات کی حقیقت کو بھی نیچرل اور عقلی انداز میں پیش کیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر خیال امروہوی کے خیالات کو ضیاءالدین لاہوری نے پیش کیا ہے۔

> ''انھوں نے قرآنی آیات کی مروجہ تفاسیر کو ناقص قرار دیا، قرآنی متشابہات اور تماثیل کے لغوی معنی متعین کیے اور پھر مفسروں کی تاریخی اغلاط کی نشان دہی کر کے ''قصص القرآن'' کو عبرت آموز بنا دیا، ورنہ مجھ جیسا جاہل تو والدین اور اساتذہ کے ارشادات کے مطالب یہی سمجھتا کہ وحی الٰہی زمینی چیز نہیں بلکہ آسمانی ہے، منزل من اللہ، لیکن اس کی مادی تشریح مقالات سر سید...... میں ملی جس سے معلوم ہوا کہ وحی الٰہی کی وہ تفسیر درست نہیں جو اہل مذاہب کے یہاں رائج ہے۔ اسی طرح معجزات کی حقیقت کو بھی سرسید نے انتہائی نیچرل انداز میں بیان کیا ورنہ اب تک تو ہم معجزات کو 'بھان متی' کا تماشہ ہی خیال کرتے آئے تھے کہ ''مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ''۔[۴]

سرسید کے مذہبی نظریات سے اتفاق و اختلاف کا سلسلہ دیر تک چلتا رہا اور اب بھی اس حوالے سے لکھا جا رہا ہے۔ سرسید کے مذہبی خیالات کی وجہ سے ان پر کفر کے فتوے بھی لگے مگر یہ بات اپنی جگہ اہم ہے کہ سرسید شاہ غلام علی دہلوی کے عقیدت مند تھے اور ان کے دل میں شاہ صاحب کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اس حوالے سے ضیاء الدین لاہوری نے مولانا حالی کے خیالات کو پیش کیا ہے:

> ''سرسید نے ایک دفعہ شاہ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے ہمارے سامنے یہ کہا تھا کہ ''گو اُس قسم کی عقیدت جیسی مریدوں کو اپنے شیخ کے ساتھ ہوتی ہے، مجھ کو نہیں ہے لیکن نہایت قوی تعلق اور رابطہ اخلاص میرے دل میں شاہ صاحب کے ساتھ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ میری لائف میں اس بات کی تصریح کی جائے۔''[۵]

سرسید احمد خاں نہ صرف شاہ غلام علی سے عقیدت رکھتے تھے بلکہ ان کے مذہبی عقائد بھی ایک عام مسلمان کی طرح تھے۔ وہ بعض لوگوں کے نزدیک ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ سرسید کے مذہبی عقائد کے حوالے سے بہت سے لوگوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اسی حوالے سے اپنی کتاب باقیاتِ شبلی میں مشتاق حسین نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے انھیں ضیاء الدین لاہوری نے پیش کیا ہے:

> ''میں خدا کو حاضر ناظر جان کر گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک اور قدیم ہے ساتھ تمام اپنے اسماء و صفات کے، جیسا کہ قرآن اور حدیث اور کتب عقائد میں مذکور ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، انبیاء و رسل اس کے فرستادہ اور برگزیدہ ہیں، جن کے سبب سے ہم کو خدا کی رضا مندی اور نجات کا راستہ معلوم ہوا، اور جو کچھ رسول ﷺ کے ارشادات ہیں سب بجا اور درست ہیں۔ تنقیح حدیثوں کی علماء امت نے کر دی ہے اور ائمہ مجتہدین نے فروعات مسائل تحقیق کیے۔ وہ لوگ سب برحق ہیں اور ہم خلفائے راشدین کو بہ ترتیب خلافت حق جانتے ہیں اور تمام صحابہ وا کابر تابعین اور اولیائے امتِ کو مقدس اور پیشوا سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اپنے

عصر کے علماء اور مشائخ، جو حضرت دہلی میں رونق افروز تھے، میں نے ''آثار الصنادید'' میں ان کا ذکر کیا ہے اور مناقب لکھے ہیں۔ کیا وہ سب تحریرات میں غلط سمجھتا ہوں، نعوذ باللہ؟ اور جس نے اتنا بڑا آسمان اور زمین اور تمام مادیات و مجردات بنائے، کیا اس کی قدرت بہشت و دوزخ وغیرہ تمام عُلویات بنانے میں عاجز ہے؟ کیا ہم تمام مخلوق کو بنا کر اور یہاں کی راحتیں اور مصائب دے کر عذاب و ثواب آخرت میں نہیں کر سکتا؟ اور جس نے تمام حشرات الارض اور چرند و پرند لاکھوں کی طرح کے بنائے، یہاں تک کہ ہوا ایسی مخلوق بنائی کہ چھوتی ہے اور نظر نہیں آتی اور تمام لطیف و کثیف اور الطف و اکثف بنائے، کیا ملائک اور قوم جن بنا نہیں سکتا؟ علاوہ اس کے ہزاروں صنائع و بدائع ہم مخلوقات کو عقل اور صفائی ذہن اور جولانی طبع دے کو بنوا ڈالے اور باوجود کمال مجبوری ہر قسم کے بے شمار اختیارات بھی عطا کیے، کیا وہ ان عطا کردہ اختیارات سے بڑھ کر خود اختیار اعلیٰ سے اعلیٰ نہیں رکھتا؟ اور بہت سے امور مخلوقات میں اور عجائب، عجائب دنیا میں ایسے موجود ہیں کہ بیشتر مخلوق کی عقل ان کے سمجھنے سے قاصر ہے، تو کیا معاملاتِ الٰہی اور عالمِ عُلویات اور عالمِ آخرت اس کوتاہ بین عقل سے ہم لوگ سمجھ سکتے ہیں؟ تو جو کچھ خدا اور رسول خدا کے فرمودہ ہیں، خواہ ہم سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں، سب برحق ہیں۔ یہی معجزات کا حال ہے۔ زیادہ تو ضرورت معاملات دنیا میں ہے اور اس کے تعقل اور فہم سے ترقی کی امید ضرور ہے۔ دیکھو فلسفہ اور سائنس نے دنیا کے متعلق کہاں کہاں تک رسائی کی ہے! صرف ان معاملات دُنیاوی کی طرف رجوع کرنے کو ہم نے سعی بلیغ کی، کالج مہیا کیا، تعلیم کا رواج ان ممالک میں جاری کیا۔ ظاہر بین اس میں تشدد کرتے تھے، اس تشدد کو تقریر و تحریر سے دفع کرتے رہے تا کہ ہماری قوم بھی ترقی دنیاوی کرے۔''[۶]

سرسید احمد خاں اسلام پر کامل یقین رکھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ میں دین اسلام کو حق پر

سمجھتا ہوں اور اسی پر اس قدر یقین ہے کہ بڑی بڑی ڈاڑھیوں والوں، ہزار ہزار دانہ کی تسبیح رکھنے والوں کو اور جو مکہ و مدینہ سے پیر و خلیفہ و مرشد کا جبہ و دستار لے کر آتے ہیں، ان کو بھی نہیں ہے۔

سرسید احمد خاں کے عقائد کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے عقائد کے حوالے سے بلاشبہ ایک سچے اور پکے مسلمان تھے۔ توحید پرست، عاشقِ رسول ﷺ تھے، مذہبی فرائض ادا کرتے تھے اور مسلمانوں کے سچے ہمدرد اور خیر خواہ تھے۔ انھوں نے مذہب کو عقلی اصولوں پر پرکھنے کی کوشش کی۔ سرسید کے عقائد کی پختگی کے حوالے سے ضیاء الدین لاہوری نے ریاض الرحمٰن شروانی کے نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے:

> ''...... جہاں تک ان کے مذہبی عقائد کا تعلق ہے، وہ بلاشبہ ایک پکے اور سچے مسلمان تھے، موحد کامل، عاشق رسول ﷺ، فرائض کی ادائیگی کے پابند اور مسلمانوں کے حقیقی خیر خواہ۔ ان کا اصرار مذہب کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے اور اس کی روشنی میں دیکھنے سمجھنے پر تھا۔ بالخصوص وہ قرآن فہمی میں تعقل، تفکر اور تدبر پر بہت زور دیتے تھے۔ خود قرآن مجید میں بھی بار بار یہی ارشاد ہوا ہے۔ اس لحاظ سے سرسید کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہے تھے جو قرآن مجید کی روح سے متعارض ہوتی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ عقلیت کو جتنی دُور تک لے گئے، مذہب میں عقلیت اتنی دور تک نہیں جاتی ہے۔ عقلیت کی حدود ہیں اور جب وہ ان سے تجاوز کرتی ہے تو دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اگر ہم ہر مسئلے کی کسوٹی عقل کو بنائیں تو سوال پیدا ہوتا ہے، کس کی عقل؟ عرب کی اُن بادیہ نشینوں کی عقل جن پر سب سے پہلے قرآن نازل ہوا یا سرسید کے دور کے ہندستانیوں کی عقل یا آج کے زمانے کے امریکہ اور کینیڈا میں رہنے والے انسانوں کی عقل اور ایک دور اور ایک ملک میں بھی حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کی عقل یا ابو طالب اور ابولہب کی عقل، سرسید کی عقل یا مولانا محمد قاسم کی عقل، مولانا ابوالکلام آزاد کی عقل یا مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی عقل، سلمان رُشدی کی عقل یا رفیق زکریا کی عقل؟ قرآن مجید کی بات تو الگ ہے، محدثینِ کرام نے اسی لیے حدیث

کے معاملے میں بھی روایت کو درایت پر ترجیح دی ہے۔ بس ہمارے نزدیک سرسید نے مذہبی مسائل میں یہیں ٹھوکر کھائی ہے کہ وہ عقل کی کار فرمائی پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے ہیں۔"[۷]

اس بحث کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سرسید احمد خاں دین اسلام پر کامل یقین رکھتے تھے۔ تفسیر قرآن میں جہاں کہیں اسلام کو عقل کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش میں ان سے غلطیاں سرزد ہوئیں، یہ غلطیاں ان کی لغزش یا خطا تھی انھوں نے جان بوجھ کر اسلام کے بنیادی عقائد کی نفی نہیں کی بلکہ عقل پرستی کی رو میں بہہ گئے اور ایسی باتیں لکھ گئے جو علما اور عام مسلمانوں کے نزدیک درست نہ تھیں۔

بعض دانشوروں کا یہ بھی کہنا ہے کہ جدید علم الکلام کی بنیاد سرسید احمد خاں نے رکھی اس کی کوئی اور مثال ان سے پہلے نہیں ملتی۔ بعد میں آنے والے بہت سے مسلم دانشوروں نے اسی انداز اور طریق پر قرآن مجید کی تفسیر و تشریح کی۔ اس حوالے سے جمیل یوسف کے نقطۂ نظر کو ضیاء الدین لاہوری نے پیش کیا ہے:

"جس نئے علم کلام کو بنیاد بنا کر سرسید نے قرآن حکیم کے مطالب و معانی کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس سمت میں جو نیا راستہ دکھایا.......اس کی کوئی نظیر سرسید سے پہلے موجود نہ تھی مگر سرسید کے بعد علامہ اقبال، علامہ حمید الدین فراہی، غلام احمد پرویز، مولانا امین احسن اصلاحی اور موجودہ دور میں جاوید احمد غامدی نے اسی انداز اور طریقے پر قرآن حکیم کی تعبیر و تفسیر کی ہے۔ اس میدان میں بلاشبہ سرسید احمد خاں کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ انھوں نے جو چراغ روشن کیا، ان کے بعد آنے والوں نے اس کی روشنی میں اپنا راستہ تلاش کیا۔"[۸]

سرسید احمد خاں نے نہ صرف جدید علم الکلام کی بنیاد رکھی اور مذہب کا جائزہ عقلی اصولوں کے ذریعے کیا بلکہ انھوں نے مسلمانوں کی حالت کو سدھارنے اور اسے بہتر بنانے کے لیے انھیں جدید علوم سے روشناس کروانے کے کام کا بھی آغاز کیا۔ انھوں نے مسلم طلبہ کو انگریزی زبان سیکھنے کی طرف مائل کیا تا کہ وہ انگریزی حکومت کے ہوتے ہوئے اعلیٰ ملازمتیں حاصل کر سکیں۔ ان کا خیال

تھا کہ انگریزی زبان سے شناسائی کے بغیر اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اس حوالے سے ۱۸۹۳ء میں انھوں نے تقریر کرتے ہوئے جن خیالات کا اظہار کیا انھیں ضیاءالدین لاہوری نے پیش کیا ہے:

''انگریزی قطع نظر اس کے کہ وہ ہمارے حاکموں کی بھی زبان ہے اور علاوہ علوم حاصل کرنے کے اور بہت سے وجوہ سے ہمارے بکار آمد ہے، ہمارے دسترس میں ہے اور اس لیے لازم ہو گیا ہے کہ ہم اسی زبان میں ان علوم کو حاصل کریں۔''[9]

ہندوستان کی تقسیم دو قومی نظریے کی بنیاد پر عمل میں آئی۔ دو قومی نظریے کا مطلب و مفہوم یہی ہے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ اقوام ہیں جن کا مذہب، کلچر، زبان، رسم و رواج سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد سرسید کے مداحوں نے سرسید کو دو قومی نظریے کا بانی قرار دیا حالانکہ سرسید ایک عرصے تک ہندو، مسلم اتحاد کی بات کرتے رہے اور دونوں کو وطن کی بنیاد پر ایک قوم قرار دیتے رہے۔ اس حوالے سے سرسید احمد خاں کی متعدد تقاریر کے اقتباسات ضیاءالدین لاہوری صاحب نے پیش کیے ہیں:

''میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے قابل نہیں کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے کیونکہ ہم اس کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن جو بات کہ ہم دیکھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ہم سب، خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں، ایک حاکم کے زیر حکومت ہیں، ہم سب کے فائدے کے مخرج ایک ہی ہیں، ہم سب قحط کی مصیبتوں کو برداشت کرتے ہیں۔ یہی مختلف وجوہ ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں قوموں کو، جو ہندوستان میں آباد ہیں، ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ ''ہندو'' یعنی ہندوستان کی رہنے والی قوم''۔[10]

ضیاءالدین لاہوری نے سرسید کی ایک اور تقریر کا اقتباس پیش کیا ہے:

''اے ہندو اور مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں

ہوتے یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے اور اسی
پر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو،
مسلمان اور عیسائی بھی، جو اسی ملک میں رہتے ہیں، اس اعتبار سے سب
ایک ہی قوم ہیں۔ جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو
ملکی فائدے میں، جو ان سب کا ملک کہلاتا ہے، ایک ہونا چاہیے۔''[۱۱]

ضیاء الدین لاہوری نے اپنے مخصوص انداز تحقیق سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سرسید عمر بھر ہندو، مسلم کو وطن کی بنیاد پر ایک قوم قرار دیتے رہے جب کہ بعض دانشوروں نے حقائق کو نظر انداز کر کے سرسید کو دو قومی نظریے کا بانی قرار دیا ہے۔ اس حوالے سے رئیس احمد جعفری کا نقطۂ نظر، ضیاء الدین لاہوری نے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''دو قومی نظریہ کے اصل خالق سرسید احمد خاں تھے۔ انھوں نے بار بار اپنی
تقریروں اور بیانات میں اعلان کیا کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں اور وہ
اپنی انفرادیت کا تحفظ چاہتے ہیں۔ درحقیقت پاکستان کی خشتِ اول یہی
تھی۔''[۱۲]

رئیس احمد جعفری نے سرسید کو دو قومی نظریے کا بانی قرار دیا جبکہ سرسید عمر کے آخری حصے تک ہندو اور مسلمانوں کو وطن کی بنیاد پر ایک قوم قرار دیتے رہے۔ انھوں نے کبھی ہندو اور مسلمانوں میں تفریق نہیں کی، نہ ملک کی تقسیم کی بات کی، نہ جداگانہ انتخابات کی اور نہ ملازمتوں میں الگ کوٹے کی۔ لہٰذا جو دانش ور سرسید کو دو قومی نظریے کا بانی قرار دیتے ہیں ان کا نقطۂ نظر درست نہیں۔ انھیں سر سید کے اصل خیالات کا مطالعہ کرنا چاہیے تھا۔ سرسید اور دو قومی نظریے کے حوالے سے پروفیسر شان محمد نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے انھیں ضیاء الدین لاہوی نے من وعن پیش کیا ہے:

''سرسید کی کوئی ایسی تقریر نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ وہ ہندو اور
مسلمانوں کو دو الگ الگ قومیں تصور کرتے ہوں یا ان کے دائرہ تخیل میں
یہ تصور ہو کہ حالات کچھ اس طرح رخ پلٹیں گے کہ آنے والے دور میں سر
زمین ہند میں دو الگ الگ مملکتیں بن جائیں گی۔''[۱۳]

ضیاء الدین لاہوری نے سرسید اور دو قومی نظریے کے حوالے سے حقائق کو پیش کر کے

ایک بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے اور قارئین کے سامنے حقیقت کو روز روشن کی طرح عیاں کر دیا ہے ورنہ ایک مخصوص طبقے کے پھیلائے ہوئے اس غلط خیال کو تقویت ملتی جا رہی تھی اور لوگ یہی سمجھنے لگے تھے کہ دوقومی نظریہ سرسید کی فکر کا نتیجہ ہے حالانکہ یہ بات حقائق کے منافی ہے۔ اس حوالے سے ضیاء الدین لاہوری لکھتے ہیں:

> ''محض ''دوقومیں'' کے الفاظ استعمال کرنے سے دوقومی نظریے کی ترجمانی نہیں ہوتی۔ اس نظریے سے اتفاق کیا جائے یا اختلاف لیکن اس کا بہر حال ایک پس منظر ہے۔ سرسید کا مذکورہ بالا فلسفہ پاکستان کے دوقومی نظریے کی واضح طور پر نفی کرتا ہے۔ ایک زمانے میں تحریک پاکستان کے قائد محمد علی جناح بھی ان دونوں قوموں میں ''اتحاد کے سفیر'' کے طور پر معروف تھے مگر بعد میں انھوں نے بوجوہ اس اتحاد کی کوششوں سے ہاتھ کھینچ لیا۔ کسی شخصیت کے متعلق حتمی رائے قائم کرتے ہوئے ہمیشہ اُس کے آخری افکار مدنظر رکھے جاتے ہیں۔ سرسید کے آخری خیالات آپ نے ملاحظہ فرمائے، ان کا موازنہ اُس دوقومی نظریے کے بیان سے کیجیے جو حصول پاکستان کی بنیاد بنا۔'' [۱۴]

قیامِ پاکستان کے بعد سرسید کو غیر متنازعہ شخصیت ثابت کرنے کے لیے بہت کام کیا گیا۔ ایسا کرنے والوں میں ایک طبقہ براہ راست علی گڑھ کا تربیت یافتہ تھا اور دوسرا مغربیت کا دلدادہ تھا۔ دونوں طبقوں نے سرسید کی شخصیت کو غیر متنازعہ شخصیت ثابت کرنے کے لیے خوب کام کیا۔ اس حوالے سے اپنے موقف کے ثبوت میں لاہوری صاحب نے پروفیسر عبدالقادر خاں کی رائے کو پیش کیا ہے:

> ''قیامِ پاکستان کے بعد لکھی جانے والی تاریخ میں سرسید ایک اتنی ہی غیر متنازعہ شخصیت بن کر سامنے آئے جتنے وہ اپنے دور میں متنازعہ رہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پاکستان کی تاریخ پر جن مسلمان مصنفین نے قابل ذکر کتابیں لکھیں وہ یا تو علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے یا مغربی افکار و نظریات سے اسی حد تک متاثر اور مرعوب تھے جتنا علی گڑھ کا تعلیم یافتہ طبقہ۔

پاکستان کا سیاسی تاریخ مرتب کرنے والا دوسرا بڑا گروہ مغربی مصنفین کا تھا
جن کے لیے سرسید کے انتہائی آزاد خیالی پر مبنی نظریات، اور دین اور
سیاست کی علیحدگی کے بارے میں ان کا سیکولر نقطہ بہت جاذب توجہ بھی تھا
اور مقصد بھی۔''[۱۵]

سرسید احمد خاں کی تعلیمی مساعی کے حوالے سے جو نظریات مقبول عام ہیں ضیاء الدین لاہوری نے ان کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے اور سرسید کی تحریروں سے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ ان سے متعلق جو خیالات منسوب کیے گئے ہیں حقیقت اس سے مختلف ہے۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے لاہوری صاحب نے سرسید کے الفاظ کو نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''مدرستہ العلوم بے شک ایک ذریعہ قومی ترقی کا ہے۔ یہاں پر قوم سے
میری مراد صرف مسلمانوں ہی سے نہیں بلکہ ہند اور مسلمان دونوں
سے ہے...... ہندوؤں کی ذلت سے مسلمانوں کی اور مسلمانوں کی ذلت
سے ہندوؤں کی ذلت ہے۔ پھر ایسی حالت میں جب تک یہ دونوں بھائی
ایک ساتھ پرورش نہ پائیں' ساتھ ساتھ یہ دونوں دودھ نہ پئیں' ایک ہی
ساتھ تعلیم نہ پائیں، ایک ہی طرح کے وسائل ترقی دونوں کے لیے موجود
نہ کیے جائیں ہماری عزت نہیں ہو سکتی۔ مدرستہ العلوم کے قائم کرنے میں
میرا یہی مطلب تھا۔''[۱۶]

سرسید نے علی گڑھ کالج مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی خاطر قائم کیا، یہ بات درست نہیں۔ یہ کالج ہندوؤں کے لیے بھی تھا، صرف مسلمانوں کے لیے نہ تھا۔ اس حوالے سے سرسید کے خیالات کو ضیاء الدین لاہوری نے پیش کیا ہے:

''مجھ کو افسوس ہوگا اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ یہ کالج ہندوؤں اور
مسلمانوں کے درمیان امتیاز ظاہر کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا
ہے....... میں اس بات کے بیان کرنے سے خوش ہوں کہ اس کالج میں
دونوں بھائی ایک ہی سی تعلیم پاتے ہیں۔ کالج کے تمام حقوق' جو اس شخص
سے متعلق ہیں جو اپنے تئیں مسلمان کہتا ہے' بلا کسی قید کے اس شخص سے

بھی متعلق ہیں جو اپنے تئیں ہندو بیان کرتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ذرا بھی امتیاز نہیں۔ صرف وہی شخص انعام کا دعویٰ کر سکتا ہے جو اپنی سعی و کوشش سے اس کو حاصل کرے۔ اس کالج میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر وظیفوں کے مستحق ہیں۔'' [۱۷]

علی گڑھ کالج کے مقاصد کو لاہوری صاحب نے انتہائی غیر جانبداری سے پیش کیا ہے۔ علی گڑھ کالج قائم کرنے کے مقاصد میں جیسا کہ خود سرسید نے بیان کیا صرف اور صرف انگریزی تعلیم کا فروغ تھا۔ سرسید سمجھتے تھے کہ مذہبی تعلیم صرف برائے نام کافی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مذہبی تعلیم ہفتے میں صرف ایک دن دی جاتی تھی اور وہ بھی اس طرح کہ انگریزی تعلیم کا حرج نہ ہو۔ سرسید کے خیالات کو ضیاء الدین لاہوری نے پیش کیا ہے:

''مذہبی تعلیم کالج اور اسکول میں جو دینی قرار پائی ہے اس کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ مسلمان طالب علم ضروری مسائل عقائدِ مذہبی اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح، وراثت، ہبہ اور وصیت سے واقف ہو جائیں۔ مذہبی تعلیم کو اس قدر بڑھانا جس سے تعلیم انگریزی میں حرج اور مشکل آئے، مقصود نہیں ہے''۔ [۱۸]

لاہوری صاحب نے سرسید اور ان کی تحریک پر مفصل بحث کی ہے۔ انھوں نے سرسید کے حامیوں اور مخالفین کا نقطۂ نظر غیر جانبداری سے پیش کیا ہے اور سرسید کی اپنی تحریروں کو حوالے کے طور پر پیش کیا ہے۔ نیز ان کا خیال ہے کہ سرسید انگریزوں کے تعلیمی نظام، رسم و رواج اور طرزِ معاشرت سے بہت حد تک مرعوب تھے اور چاہتے تھے کہ ہندوستان کے لوگ بھی اسی رنگ میں رنگے جائیں اس لیے انھوں نے علی گڑھ کالج میں انگریزی طور طریقوں کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ لاہوری صاحب نے اس حوالے سے ڈاکٹر ظفر حسن کے نقطۂ نظر کو بیان کیا ہے:

''سرسید نہ صرف انگریزوں سے مرعوب تھے بلکہ انگریزوں کے رسم و رواج اور طرز معاشرت ہمارے یہاں رائج کرنا چاہتے تھے۔ انگریزی معاشرے سے بالخصوص اور مغربی معاشرے سے بالعموم ان کی دل بستگی واضح تھی۔ انگریزی کالجوں کا طرز تعلیم وہ آکسفورڈ یا کیمبرج کی دانش

گاہوں سے لینا چاہتے تھے تو تہذیب الاخلاق کا طرزِ تحریر انھوں نے ایڈیسن اور اسٹیل سے لینا پسند کیا۔''[19]

ضیاءالدین لاہوری صاحب نے اس حوالے سے مولوی عبدالحق کا نقطۂ نظر بھی پیش کیا ہے:

''مسلمانوں میں مغربی معاشرت کی شیفتگی سرسید مرحوم کی بدولت پیدا ہوئی۔ یہاں اس سے بحث کی ضرورت نہیں کہ اس سے ان کا کیا منشا تھا اور ان کا یہ خیال کن مصالح پر مبنی تھا۔لیکن یہ بلا آئی انھی دنوں اور اُنہی کی بدولت، مسلمانوں کو اسراف کا ایک اور بہانہ مل گیا۔اس معاملہ میں سرسید کے سب سے بڑے اور اول معتقد اور خلیفہ نواب محسن الملک تھے۔ان کی دیکھا دیکھی دوسروں پر بھی وہی رنگ چڑھ گیا۔''[20]

سرسید احمد خاں نے اپنے زمانے میں مغرب پرستی اور مغربی تقلید کا جو راستہ ہندوستانی نوجوانوں کو دکھایا تھا اس کے بہت سے مضر اثرات سامنے آئے۔آج بھی مغرب پسندی کا یہ کلچر ہماری قومی بنیادوں کو کمزور کر رہا ہے۔آج بھی ہمارے تعلیم یافتہ طبقے میں مغربی روایات سے مرعوبیت اور دین سے بیزاری کے عناصر موجود ہیں۔اس قومی انتشار اور آمادۂ زوال رویے کی بنیاد سرسید احمد خاں نے رکھی تھی۔اس حوالے سے ڈاکٹر شوکت سبزواری کے مؤقف کو ضیاء الدین لاہوری نے یوں پیش کیا:

''سرسید کے زمانے میں مغرب پرستی کا جو دروازہ کھل چکا تھا، وہ آج تک کھلا ہوا ہے اس کے مضر اثرات آج بھی (جب کہ پاکستان وجود میں آ چکا ہے) پوری قوم کے مذہبی وملی شعور اور اسی کے اجتماعی کردار کو گھن کی طرح کھائے جا رہے ہیں۔آج ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کی اکثریت کا یہ حال ہے کہ اسے اپنے مذہب سے کوئی لگاؤ نہیں، اپنی تاریخ سے ہمدردی نہیں، اپنی روایات سے محبت نہیں، اور ہو بھی کہاں سے جب اسے ان سب سے واقفیت ہی نہیں! اپنی زبان، ادب اور تہذیب کے لیے اس کے دل میں کوئی جگہ نہیں۔ وہ مغرب کے علمی کارناموں سے مرعوب ہے، اس کی معاشرت پر ریجھا ہوا ہے اور اس کی تہذیب کا سب سے بڑا قدر دان

ہے۔ اس قومی انتشار کی ذمہ دار وہ روایت ہے جس کا آغاز سرسید کے زمانے سے ہوا۔ اس کے مقابلے میں ہندو کو دیکھئے، اس نے مغربی علوم فنون سے اپنے ذہن کو جلا دی اور اپنی ہزار ہا سال پرانی تہذیب کو حیات نو دینے کی فکر میں لگ گیا۔''[۲۱]

قیام پاکستان کے بعد لکھنے والوں نے سرسید کو تقریباً ایک جیسا پیش کیا۔ اس حوالے سے ضیاء الدین لاہوری کا خیال ہے کہ جن دانشوروں نے سرسید کو مسلمانان ہند کے مصلح کے طور پر پیش کیا ان کے نزدیک جدید تعلیم سے روشناس کروانا اور مسلمانوں کے اندر جدید مغربی ذہن کا پیدا کرنا سرسید کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اس تاثر کو عام کرنے کی بھی کوشش کی گئی کہ ہندوستان میں جدید تعلیم کا ڈول اگر سرسید نہ ڈالتے تو ہندوستانی عوام جدید تعلیم سے محروم رہتے۔ ضیاء الدین لاہوری کے بقول یہ بھی محض خام خیالی ہے کیونکہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد علی گڑھ کے علاوہ بھی بہت سی جگہوں پر اسی طرح کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ علی گڑھ کو شہرت و مقبولیت ملی اور باقی اداروں کی اس طرح تشہیر نہ ہو سکی حالانکہ وہ ادارے بھی ہندوستان میں جدید تعلیم کے فروغ کے لیے کام کر رہے تھے۔ اس حوالے سے لاہوری صاحب نے صفدر امام قادری کے نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے:

''مسلمانوں میں جدید تعلیم کی توسیع کے حوالے سے سرسید کی خدمات بلاشبہ غیر معمولی اور بیش قیمت ہیں لیکن یہ سوچنا درست نہیں کہ صرف سر سید کے اثر سے مسلمانوں میں جدید تعلیم کو فروغ حاصل ہوا۔ اس معاملے میں سب سے زیادہ اہمیت اس عہد کے تاریخی دباؤ کی ہے کیونکہ ایک ساتھ سینکڑوں طرح کی کوششیں اس زمانے میں یہاں وہاں ہو رہی تھیں کہ مسلمانوں میں سرسید کے بغیر بھی جدید تعلیم کو بہر طور پھیلنا تھا۔''[۲۲]

ضیاء الدین لاہوری نے معروضی انداز میں سرسید سے متعلق جملہ مواد کو جمع کیا اور اپنی تحقیق کو قارئین کے سامنے رکھ دیا۔ انھوں نے سرسید کے خیالات و نظریات کو بھی انھی کے الفاظ میں پیش کیا اور حمایت اور مخالفت میں لکھنے والوں کے نقطۂ نظر کو بھی لکھنے والوں کے اصل الفاظ میں پیش کیا اور فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا کہ اس سے کیا نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ انھوں نے تحقیقی دیانت کا ثبوت

دیتے ہوئے تمام متعلقہ مواد پیش کر دیا۔ انھوں نے سر سید کی شخصیت اور ان کے افکار و نظریات پر تحقیق میں ربع صدی سے زیادہ عرصہ صرف کیا۔ پاکستان، ہندوستان اور برطانیہ کی تمام مشہور لائبریریوں کو چھان مارا اور اپنے موضوع سے متعلق مواد جمع کیا۔ ان کی تحقیقی کاوشوں اور ان کے انداز تحقیق کے حوالے سے ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری رقم طراز ہیں:

''ضیاء الدین لاہوری اس دور میں سر سید کے سب سے بڑے محقق ہیں۔ پچھلے تیس برسوں میں ان کی تحقیق کا سب سے بڑا موضوع سر سید کی شخصیت، سوانح اور علوم و افکار رہے ہیں۔ سر سید پر انھوں نے چار کتابیں اور پچاسوں مقالے لکھے ہیں۔ یہاں ان کی دو کتابوں کے مطالب زیر غور ہیں خودنوشت حیاتِ سر سید اور خودنوشت افکارِ سر سید۔ کتابیں مرتب کر دینا اور ان کا شائع ہو جانا آج کے دور میں مشکل نہیں رہا۔ چند کتابیں سامنے رکھیں اور ایک نئی کتاب بنا دی لیکن محترم ضیاء الدین لاہوری نے ان کتابوں کا مواد فراہم کرنے میں ایک قرن بتا دیا ہے۔ برس ہا برس تک انڈیا آفس، برٹش میوزیم، رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز کی لائبریریوں میں سینکڑوں کتابوں، فائلوں اور دستاویزوں کی خاک چاٹی ہے اور پاکستان کے تاریخی علمی خزائن سے استفادے اور مواد کی تنقید اور غور و فکر کے بعد یہ کتابیں مرتب کی ہیں....... سر سید کی شخصیت، ان کے سوانح، ان کے افکار، زندگی کے حوادث اور سیرت و خدمات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے بارے میں سر سید نے کچھ بیان کیا ہو یا اُن کے قلم سے نکلا ہو اور ان کتابوں میں اپنے محل میں سلک تالیف میں اسے نہایت سلیقے سے پرو نہ دیا گیا ہو۔ جو کچھ ہے، سر سید کی زبان اور ان کے قلم سے ہے۔ مؤلف نے کوئی جملہ اپنی طرف نہیں لکھا، کسی بات پر خوب و زشت کا حکم نہیں لگایا، ان کی کسی بات کو تختۂ مشق اور ہدف تنقید نہیں بنایا۔ خودنوشت حیات اور افکار کی دو جلدیں تعارف و مقدمات وغیرہ کو چھوڑ کر چھ سو صفحوں سے زیادہ

پر مشتمل ہیں ان کے مواد کو اپنی تحریر و تبصرے کے شرک سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ غلط یا صحیح، اچھا یا برا جو کچھ ہے خواہ آپ کو پسند آئے خواہ نہ آئے، سرسید کا ہے اور وہی اس کے ذمہ دار ہیں۔"[۲۳]

لاہوری صاحب نے تحقیق کر کے ایسی بہت سی تحریروں کی نشاندہی کی ہے جو سرسید کے حق میں لکھنے والوں کی ہیں اور ان میں حقائق کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد سامنے آنے والی تحریروں میں صریحاً متضاد معلومات پیش کی گئیں۔ بعض لکھنے والوں نے حقائق کی سراسر نفی کرتے ہوئے سرسید کو ان کے اصل خیالات و نظریات سے الگ کر کے پیش کرنے کی کوشش کی۔ بعض نے سرسید کو انگریزوں کا دشمن قرار دیا، بعض نے لکھا کہ وہ انگریزی اقتدار کے خلاف تھے، بعض نے انھیں اسلام کا محافظ اور علمبردار لکھا، کسی نے ان کے ہاتھوں پاکستان کی خشتِ اوّل رکھوائی تو کسی نے انھیں اقبال اور جناح کا پیشرو قرار دیا۔ غرض سرسید کی شخصیت اور ان کے نظریات کے حوالے سے پاکستانی عوام کے سامنے سرسید کی ایسی تصویر پیش کی گئی جس سے ضیاء الدین لاہوری کو اتفاق نہیں ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد لکھنے والے بعض دانشوروں نے سرسید کو دو قومی نظریے کا بانی قرار دیا۔ ایسے دانشوروں نے حقائق کے برعکس لکھا کہ سرسید نے بار بار اپنی تقاریر میں یہ اعلان کیا کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہے اور وہ اپنی انفرادیت چاہتے ہیں۔ ایسے دانشوروں نے یہ بھی لکھا کہ پاکستان کی خشتِ اوّل سرسید احمد خاں نے رکھی۔ اس حوالے سے رئیس احمد جعفری کے خیالات ماقبل صفحات میں پیش کیے جا چکے ہیں۔

رئیس احمد جعفری کے ساتھ ساتھ غلام احمد پرویز بھی پاکستان کا معمارِ اوّل سرسید کو قرار دیتے ہیں۔ ان کی رائے کو ضیاء الدین لاہوری نے پیش کیا ہے:

"سرسید ہی درحقیقت پاکستان کا معمارِ اوّل ہے جس نے اس مملکت کی "پہلی اینٹ" اس دن رکھی جب اس نے علی گڑھ مدرسہ کا افتتاح کیا تھا۔ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو اس مدرسے کی بنیاد رکھی گئی جسے میں پاکستان کی بنیاد میں "پہلی اینٹ" قرار دیتا ہوں۔"[۲۴]

سرسید کے حق میں لکھنے والے دانشوروں نے اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ اگر سرسید نہ

ہوتے تو ابوالکلام آزاد کی تفسیر سامنے نہ آتی، نہ اقبال فلسفہ خودی پیش کرتے، یعنی مسلمانانِ ہند میں کوئی عالی دماغ پیدا ہی نہ ہوتا۔ اس حوالے سے خورشید السلام صدیقی کے خیالات کو ضیاء الدین لاہوری نے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں:

''اگر یہ درویش نہ ہوتا تو ابوالکلام کی تفسیر وجود میں نہ آتی اور نہ خودی کا فلسفہ فارسی زبان میں نازل ہوتا۔ ابوالکلام اور اقبال کہاں ہوتے، کون جانتا ہے؟ البتہ اس قدر یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ہوتے تو یہ مصرع گنگناتے کہ:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا''[۲۵]

یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ سرسید احمد خاں نے مسلمانانِ ہند کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے اس دور ابتدا میں کہ جب مسلمان اپنا اقتدار و اختیار کھو چکے تھے اور کوئی ان کا پرسانِ حال نہ تھا، مسلمانوں کو پستی سے نکالنے کی کوشش کی۔ انگریزی حکومت اور مسلمانوں کے درمیان فاصلوں کو کم کیا اور مسلمانوں کے لیے جدید تعلیم کا بندوبست کیا، مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کی۔ انھی کی کوششوں سے ہندوستانی مسلمانوں میں انقلابی سوچ پروان چڑھی۔

سرسید کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کے اندر علمی و ادبی اور سیاسی سطح پر ایک انقلاب آیا۔ سرسید کے رفقا نے بھی مسلمانوں کی علمی و ادبی ترقی کے لیے اپنا اپنا کردار ادا کیا۔ حالی، نذیر احمد، مولانا شبلی نے علمی و ادبی حوالے سے مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ آلِ احمد سرور کے بقول اگر سرسید نہ ہوتے تو شاید یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ اس حوالے سے آلِ احمد سرور کے خیالات کو ضیاء الدین لاہوری نے پیش کیا ہے۔

''سرسید کی رہنمائی نہ ہوتی تو حالی کی عظیم الشان کوششیں بارآور نہ ہو سکتیں، علامہ شبلی مولوی ہی رہتے، نذیر احمد عربی کے ایک زبردست عالم کہلاتے، اردو میں ان کا یہ مرتبہ نہ ہوتا۔ وہ نئی نسل وجود میں نہ آتی جس نے اقبال کی شاعری، سجاد حیدر کی نثر، عبدالقادر کے مضامین اور ظفر علی خاں، محمد علی، طفیل احمد کی صحافت کے ذریعہ سے ایک نئی مشرقیت کا چراغ روشن کیا۔''[۲۶]

سرسید احمد خاں کی صحافتی خدمات بھی لائق تحسین ہیں۔ بہت سے لکھنے والوں نے سر سید احمد خاں کو جدید صحافت کا پیشرو قرار دیا ہے۔ سرسید نے اپنی تحریروں کے ذریعے نئی اور مثبت سوچ کو فروغ دیا۔ انھی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں میں بہت سی ایسی شخصیات سامنے آئیں جنھوں نے اسلامیانِ ہند کے ذہنوں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ بہت سے لکھنے والوں نے اس بات کا اظہار کیا کہ اگر سرسید نہ ہوتے تو بہت سی وہ ہستیاں نہ ہوتیں جو آج نمایاں ہیں۔ اسی حوالے سے آلِ احمد سرور کے خیالات کو لاہوری صاحب نے پیش کیا ہے:

> ''اگر سرسید کی تہذیبی تحریک نہ ہوتی تو شبلی مولوی شبلی ہی رہتے، مہدی افادی کے الفاظ میں تاریخ کے معلمِ اوّل نہ بنتے، آزاد کی کوششوں کو فروغ نہ ہوتا، حالی کی معرکتہ الآراء مسدس نہ لکھی جاتی، ''مقدمہ شعروشاعری'' تصنیف نہ ہوتا، نذیر احمد کے تمثیلی قصے واقعیت اور مقصدیت کا آغاز نہ کرتے، نہ محمد علی ہوتے نہ اقبال، نہ ترقی پسند تحریک ہوتی نہ ادب عروس زندگی کا شانہ بنتا۔'' [۲۷]

سرسید احمد خاں کی خدمات کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ انھوں نے علمی و ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ سیاسی وسماجی اور معاشرتی حوالے سے بھی قوم کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا۔ مسلمانانِ ہند نے ترقی کی جو منازل طے کیں ان کا راستہ سرسید نے ہی دکھایا تھا۔ اگر وہ مسلمانوں کی جدید تعلیم کے لیے علی گڑھ کالج قائم نہ کرتے تو مسلمانوں کے اندر نئی سوچ جنم نہ لیتی، نہ مسلمانوں کو بڑے بڑے لیڈر میسر آتے اور نہ علمی و ادبی حوالے سے مسلم قوم آگے بڑھ پاتی۔ مدرستہ العلوم کی ابتدا نہ کرتے تو محمد علی جوہر ہوتے نہ مولانا ظفر علی خاں، اقبال آتے اور نہ ہی جناح کی صورت میں برصغیر کے مسلمانوں کو ایک بہادر اور جری لیڈر ملتا۔

صفدر سلیمی کے نقطۂ نظر کو ضیاء الدین لاہوری نے اپنے خیالات کی آمیزش کیے بغیر انھی کے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ اسی طرح کے خیالات کا اظہار بعض دوسرے لکھنے والوں نے بھی کیا ہے کہ اگر سرسید نہ ہوتے تو آج مسلمانانِ ہند کا خدا جانے کیا حال ہوتا اور یہاں کوئی بڑا دماغ، کوئی بڑا لیڈر، دانشور پیدا نہ ہوتا اور آج مسلمان انتہائی پستی کی زندگی گزار رہے ہوتے۔ ضیاء الدین لاہوری نے ایسے کئی نامور قلم کاروں کے خیالات کو پیش کیا ہے جنھوں نے کہا ہے کہ اگر

سرسید نہ ہوتے تو ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت زیادہ اچھی نہ ہوتی، اور ان میں کوئی بڑا لیڈر جنم نہ لیتا۔ اور نہ پاکستان دنیا کے نقشے پر ایک آزاد اسلامی ریاست بن کر ابھرتا۔ اس حوالے سے ضیاء الدین لاہوری نے غلام احمد پرویز کے خیالات کو پیش کیا ہے:

''اگر سرسید مولانا حضرات کے فتووں کے سامنے سپر انداز نہ ہوتا تو آج نہ پاکستان دنیا کے نقشے پر موجود ہوتا، نہ کوئی اقبال اور جناح کا نام جانتا۔''[۲۸]

غلام احمد پرویز نے ایسے ہی خیالات کا اظہار ایک اور تحریر میں بھی کیا ہے جسے ضیاء الدین لاہوری نے بعینہٖ پیش کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''اگر سرسید یہ کچھ نہ کر جاتا تو نہ محمد علی ہوتا نہ شوکت علی، نہ اقبال ہوتا نہ جناح، اور ہم آج ہندوستان میں شودروں کی سی زندگی بسر کر رہے ہوتے۔''[۲۹]

سرسید تحریک اور ان کی شخصیت کے حوالے سے سرسید کے حق میں لکھنے والے موجود ہیں وہاں ان کے خلاف اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ ضیاء الدین لاہوری نے دونوں اطراف کے نقطۂ ہائے نظر کو پیش کیا ہے اور انھوں نے اپنے خیالات کی آمیزش کیے بغیر قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے، جہاں اس خیال کا اظہار کرنے والے موجود ہیں کہ اگر سرسید نہ آتے تو جناح، اقبال، ظفر علی خاں، محمد علی جوہر نہ آتے، نہ پاکستان بنتا، وہاں اس بات کا اظہار کرنے والے بھی موجود ہیں کہ اس طرح کے خیالات پیش کرنا درست نہیں۔ کیونکہ ہر مفکر ازل سے اپنی متاعِ فکر کا مالک ہوتا ہے۔ وہ اپنے اسلاف سے کسبِ فیض ضرور کرتا ہے۔ وہ اسلاف کے فکر و نظر سے بیگانہ رہ کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ وہ ان سے کسی نہ کسی سطح پر اثرات ضرور قبول کرتا ہے۔ یہ کہنا درست نہیں کہ اگر سرسید نہ ہوتے تو یہ نہ ہوتا اور وہ بھی نہ ہوتا۔

سرسید احمد خاں کی شخصیت اور ان کے افکار و نظریات کے حوالے سے لکھنے والے بہت سے قلم کاروں کا کہنا ہے کہ اگر سرسید مسلمانوں کی جدید تعلیم کے لیے کوششیں نہ کرتے اور انھیں تقاضائے حال سے باخبر نہ کرتے تو آج ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود معدوم ہو چکا ہوتا یا ان کی حالت شودروں جیسی بلکہ ان سے بھی بدتر ہوتی۔ مسلمان اپنا وجود کھو چکے ہوتے اور ہندوستان کا مورخ ہماری موت کا مرثیہ کب کا لکھ چکا ہوتا۔

صفدر سلیمی جیسے خیالات کا اظہار ریاض الرحمٰن شروانی نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگر سرسید مسلمانوں کی جدید تعلیم کے لیے کوشش نہ کرتے تو آج مسلمانوں کی حالت شودروں سے بھی بدتر ہوتی۔ ریاض الرحمٰن شروانی کے خیالات کو ضیاء الدین لاہوری نے یوں پیش کیا ہے:

> ''اس برصغیر میں تو مسلمان شودروں سے بدتر ہوتے، اگر سرسید نے ان کی تعلیمی اور معاشرتی زندگی میں رہنمائی نہ کی ہوتی۔ سرسید کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے جتنا بڑا کارنامہ پچھلے سوا سو، ڈیڑھ سو برسوں میں کسی اور کا نہیں۔''[۳۰]

سرسید کی تعلیمی اور اصلاحی تحریک کا تذکرہ جناب احمد ندیم قاسمی نے بھی بڑے مثبت انداز میں کیا ہے۔ انھوں نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر سرسید نہ ہوتے تو مسلمانوں کو برصغیر میں جدید تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔ مسلمانوں کو نہ صرف جدید تعلیم نہ ملتی بلکہ مسلمانوں کا غیرت مند وجود برقرار رکھنا بھی مشکل ہو جاتا۔ اس حوالے سے ضیاء الدین لاہوری نے احمد ندیم قاسمی کے خیالات کو پیش کیا ہے۔

> ''اگر سرسید انیسویں صدی کے نصف آخر میں اپنی اصلاحی تحریک نہ چلاتے تو نہ صرف یہ کہ ان حضرات کا جدید تعلیم سے مسلح ہونا مشکوک تھا بلکہ ہم سب لوگوں کا، جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، غیرت مندانہ وجود تک مشکوک تھا۔''[۳۱]

سرسید کی شخصیت اور ان کی تحریک کے اثرات و ثمرات کو خلیل الرحمٰن داؤدی نے بھی اس نظر سے دیکھا ہے۔ ان کا بھی یہی خیال ہے۔ اگر سرسید نہ ہوتے اور وہ مسلمانوں کی اصلاح کے لیے تحریک نہ چلاتے تو خدا جانے مسلمانانِ ہند کا کیا حال ہوتا۔ نہ ان کو پاکستان کی صورت میں ایک آزاد اور خود مختار اسلامی ملک ملتا اور نہ ہی متحدہ ہندوستان میں ان کو کوئی کام ملتا۔ خلیل الرحمٰن داؤدی کے خیالات کو ضیاء الدین لاہوری نے نقل کیا ہے۔

> ''اگر سرسید احمد خاں کی دُور اندیشی نے علی گڑھ نہ بنایا ہوتا تو نہ معلوم آج کے مسلمانوں کا کیا حال ہوتا! نہ تو پاکستان بنتا اور نہ ہندوستان میں انھیں کوئی کام ملتا۔''[۳۲]

سرسید اور ان کی تحریک کے حوالے سے بعض دوسرے قلم کاروں نے بھی ایسے ہی خیالات

کا اظہار کیا ہے۔ضیاءالدین لاہوری نے تمام قلم کاروں کے خیالات کو بعینہٖ پیش کر دیا ہے تا کہ قاری اصل خیالات کو پڑھ سکے اور تجزیہ کر سکے۔انھوں نے اِن خیالات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور نہ ہی ان کا تجزیہ یا ان پر تنقید کی ہے۔سرسید اور ان کی تحریک کے حوالے سے چند اور قلم کاروں کے خیالات ملاحظہ ہوں۔جنھیں ضیاءالدین لاہوری نے پیش کیا ہے۔پروفیسر علی احمد عباس نے لکھا ہے:

''اگر اللہ تعالیٰ نے اس وقت سرسید کو اس مجددانہ بصیرت سے سرفراز نہ فرمایا ہوتا تو نہیں کہا جا سکتا کہ مسلمانوں پر کیا گزرتی؟''[۳۳]

بشیر احمد ڈار کے خیالات کو ضیاءالدین لاہوری نے یوں پیش کیا ہے

''سرسید کے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا حکومت سے سو فیصدی تعاون اور وفاداری کا اظہار تا کہ وہ دو دُشمنوں کے پاٹ میں آ کر پس نہ جائیں۔اگر وہ ایسا قدم نہ اٹھاتے تو اس ملک میں مسلمانوں کا وجود یقیناً خطرے میں پڑ جاتا۔''[۳۴]

عبدالسلام خورشید کا خیال ہے:

''اگر سید مسلمانوں کی ان تحریکوں سے الگ تھلگ رکھنے کی کوشش میں کامیاب نہ ہوتے تو آج پاکستان بنانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی کیونکہ اس برعظیم میں مسلمانوں کا وجود نہ ہوتا۔''[۳۵]

ضیاءالدین لاہوری نے غلام رسول مہر کے خیالات کو بھی پیش کیا ہے۔

''....سرسید نے مسلمانوں کے لیے یہی کیا۔اگر وہ بروئے کار نہ لاتے اور سب کچھ نہ کرتے جس کے لیے ان کی زندگی وقف رہی تو سوچو، آج مسلمانوں کا وجود بھی بحیثیت ملت وقوم محفوظ ہوتا؟''[۳۶]

بعض قلم کاروں کا یہ بھی خیال ہے کہ سرسید اگر اپنی کوششوں سے مسلمانوں اور ہندوستان کی انگریزی حکومت کے درمیان پل کا کردار ادا نہ کرتے اور فاصلوں کو کم کرنے کی کوشش نہ کرتے تو اس سے مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا اور ہندوستان سے اسلام کا نام اِسی طرح مٹ جاتا جس طرح سپین سے ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔اس حوالے سے ذاکر حسین فاروقی کے خیالات کو ضیاءالدین لاہوری نے یوں پیش کیا ہے:

''اگر سرسید ...... انگریزوں کے اس اشتعال کو، جو انقلاب ۵۷ء کے بعد ان میں پیدا ہو گیا تھا، وفا شعاری کے پانی سے نہ بجھا دیتے تو آج ہندوستان سے اسلام کا نام اسی طرح فنا ہو جاتا جس طرح سپین سے ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔''[۳۷]

سرسید احمد خاں کی شخصیت اور ان کی تحریک کے حوالے سے اور بھی کئی صاحبان نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے، اور لکھا ہے کہ سرسید احمد خاں کی ذات کو قضا و قدر کے دربار سے اس منصبِ جلیلہ پر فائز کرنے کے لیے چن لیا گیا تھا۔ انھی کی وجہ سے مسلمانانِ ہند کی سوئی ہوئی قسمت بیدار ہوئی اور ان کے مقدر کا ستارا چمکا اور سرسید کی زندگی ہی میں ان کے افکار کی روشنی سے ہندوستان کا کونہ کونہ چمک اٹھا۔ اس حوالے سے صلاح الدین احمد کے خیالات کو ضیاء الدین لاہوری نے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں:

''سید احمد خاں ...... جس قضا و قدر کے دربار سے اس منصب عالی پر فائز کر دیا گیا تھا جو خداوند تعالیٰ کے محض چند منتخب اور برگزیدہ بندوں کے لیے ازل سے مخصوص ہے۔ یہ منصب رشد و ہدایت اور ایثار و خدمت کا وہ منصبِ جلیل تھا جو عالمِ انسانیت کے عظیم راہبروں میں سے بہت کم اکابر کو ارزانہ ہوتا ہے۔ سرسید احمد خاں مرحوم انھی اکابر میں سے ایک فردِ عظیم تھے اور ان میں سے کس کو کلام ہے کہ جس لمحے انھیں یہ سعادتِ عظمیٰ نصیب ہوئی، اس لمحے ان کی قوم کے مقدر کا ستارہ چمک اٹھا اور اس کی ضوفشانیوں سے محض ان کی زندگی ہی میں اس برعظیم کا گوشہ گوشہ مستفید ہو گیا........''[۳۸]

سرسید احمد خاں کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو اہل قلم نے زبردست خراج تحسین پیش کیا اور متعدد اہل قلم نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ اگر سرسید مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش نہ کرتے تو مسلمانوں کی حالت زیادہ اچھی نہ ہوتی۔ اس قسم کے خیالات کا اظہار کرنے والوں کی رائے کی بنیاد مولانا حالی کے ان افکار پر ہے جو انھوں نے حیاتِ جاوید میں پیش کیے۔ حالی نے سرسید احمد خاں کے حالاتِ زندگی لکھتے وقت ان کی خوب طرف داری کی تھی اور اسی

وجہ سے ان کی اس کتاب کو ''مدلل مداحی'' بھی قرار دیا گیا تھا۔ انھوں نے جس انداز میں سرسید احمد خاں کی مدح کی بعد میں آنے والے بہت سے قلم کاروں نے بھی اس انداز کو اپنایا اور ان کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔

مولانا حالی کا چونکہ سرسید احمد خاں کے ساتھ بہت قریبی تعلق تھا۔ اس لیے انھوں نے پوری حیات جاوید میں کوئی ایسی بات نہ لکھی جو سرسید کے ذاتی نقائص کو ظاہر کرتی۔ بلکہ ایسی باتوں کو دبا دیا گیا۔ ایسا کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حالی، سرسید کی شخصیت سے حد درجہ متاثر تھے اور انھوں نے کتاب لکھنے سے پہلے ہی یہ ٹھان لی تھی کہ سرسید کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا۔ اس کے ساتھ مولانا حالی کا یہ بھی خیال تھا کہ زمانہ ''کرٹیکل بائیوگرافی'' لکھنے کا نہیں تو ایسے میں غیر جانبدارنہ سوانح حیات کیسے لکھی جا سکتی تھی۔ بعض لکھنے والوں کا یہ بھی خیال ہے کہ مولانا حالی سرسید تو کیا کسی کی بھی ''کرٹیکل بائیوگرافی'' نہ لکھ سکتے تھے اور حیاتِ جاوید میں تو ایسا کرنا حالی کے لیے ممکن ہی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حالی نے سرسید کی خوبیوں کو تو خوب اجاگر کیا مگر نزاعی امور میں معذرت خواہانہ رویہ اپنایا۔ اس حوالے سے ضیاء الدین لاہوری نے پروفیسر سلیم اختر کے خیالات کو پیش کیا ہے:

> ''کسی متنازعہ فیہ شخصیت کے بارے میں اگر شخصیت نگار نے پہلے سے ہی دل ہی دل میں ٹھان رکھی ہو کہ ''اس کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا'' تو نتیجہ ظاہر ہے۔ اس کے ساتھ جب شخصیت نگار کو یہ احساس بھی ہو کہ زمانہ ''کرٹیکل بائیوگرافی'' لکھنے کا نہیں تو ایسے میں اس کا سونا کسوٹی پر پرکھنا، اس کا کھرا پن ٹھوک بجا کر دیکھنا اور ''نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے'' وغیرہ محض خالی دعوے ہی رہ جاتے ہیں۔ دراصل حالی طبعاً سرسید تو کیا کسی کی بھی ''کرٹیکل بائیوگرافی'' نہ لکھ سکتے تھے۔ حیاتِ جاوید میں یہ انداز پیدا کرنا اور بھی مشکل تھا کہ وہ خود بھی سرسید کو ''ہیرو'' اور ''مثالی'' شخصیت سمجھتے تھے، اس لیے وہ خوبیوں کو تو خوب صورتی کے ساتھ اجاگر کرتے ہیں لیکن نزاعی امور میں معذرت، جواز اور توجیہات پیش کرتے ہیں۔''[۳۹]

ضیاء الدین لاہوری نے سرسید احمد خاں کی حمایت اور مخالفت میں لکھی گئی تمام تحریروں کو تحقیق کر کے جمع کیا اور ان کو مرتب صورت میں قارئین کی نذر کر دیا۔ انھوں نے اپنی تحقیق میں لکھنے والوں کے خیالات کو انھی کے الفاظ میں پیش کیا۔ انھوں نے اِن خیالات میں اپنے نظریات کی آمیزش نہیں کی بلکہ معروضی اندازِ تحقیق کو اپناتے ہوئے مصنفین کے خیالات کو انھی کے الفاظ میں پیش کیا۔ انھوں نے ایسا کرتے وقت پوری دیانتداری سے مختلف اہلِ قلم کے موقف کو پیش کیا اور کہیں کمی بیشی نہیں کی۔ نہ ان خیالات پر تنقید و تبصرہ کیا۔ یوں انھوں نے جو کچھ قارئین کے سامنے پیش کیا وہ سب مختلف اہل قلم حضرات کی اپنی آرا ہیں۔

سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا نے اردو نثر کے فروغ کے لیے بھی بڑا کام کیا۔ خود سرسید احمد خاں نے **تہذیب الاخلاق** میں جو مضامین لکھے انھوں نے اردو نثر کے فروغ کے لیے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے نہ صرف طرزِ نو اور نئے اسلوب کو متعارف کرایا بلکہ موضوعاتی سطح پر بھی اردو نثر کے دامن کو مضامین نو سے سجایا اور مرصّع کیا۔ ان کے طرزِ جدید نے بہت جلد قارئین کی توجہ حاصل کر لی۔ سرسید کی نثر کے حوالے سے رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

> ''اُن کے طرز جدید نے قدیم تصنع نگاری پر جو بیدل اور ظہوری کی فارسی کی تقلید میں اُردو میں بھی برتی جاتی تھی، ایک ضرب کاری لگائی، اور یہ ثابت کر دیا کہ سادہ اور بے تکلف عبارت میں تصنع سے زیادہ خوبیاں ہیں۔ مضمون کو دیکھو اور عبارت آرائی سے غرض نہ رکھو سرسید صاحب کا عمل تھا اور حقیقت میں یہی حال اُن کی تمام تحریروں کا ہے۔ ان کی عبارت اُن کے ادائے مطالب میں کبھی قاصر نہیں ہوتی۔ اُن کو زبان پر عبور حاصل ہے۔ سب سے بڑی خوبی سید صاحب میں یہ تھی کہ وہ مشکل سے مشکل اور دقیق مضمون کو خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی نہایت صاف اور بے تکلف زبان میں ادا کر سکتے تھے اور نیز اپنے مضامین کے حُسن و قبح کو بھی نہایت زوردار الفاظ میں وضاحت سے بیان کر سکتے تھے۔''[۴۰]

سرسید احمد خاں نے مقفع و مسجع نثر کی بجائے سادہ نثر کو اپنایا اور اپنی تحریروں سے اردو نثر کے دامن کو وسعت بخشی۔ انھوں نے اردو میں مضمون نگاری کی ابتدا کی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے

بقول سرسید ''اردو کے اولین مضمون نگار'' ہیں۔ اولین اس معنی میں کہ انھوں نے سب سے پہلے شعوری طور پر مضمون یا Eassay کی صنف کو اختیار کیا۔ ان کے دیگر ساتھیوں نے بھی اردو نثر کے فروغ کے لیے خوب کام کیا۔ اردو نثر کے حوالے سے سرسید اور ان کے رفقا کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''وہ عہد ایسا زرخیز ثابت ہوا کہ جن نئی اصناف کی کونپلیں پھوٹیں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہاں جڑ پکڑ گئیں بلکہ ''Essay'' تو خود سرسید احمد خاں ہی نے متعارف کرایا....... سرسید کے موضوعات کی سنجیدگی، عبارت کا مقفّیٰ انداز اور عقلیت پر مبنی ذہنی رویہ انھیں باقاعدہ مقالہ یا مضمون بنا دیتا ہے...... حالی نے مقدمہ شعر و شاعری (۱۸۹۳ء) لکھ کر باقاعدہ تنقید نگاری کی داغ بیل ڈالی۔ ان کے ساتھ اس سلسلہ میں شبلی کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ان دونوں نے سوانح عمریاں لکھ کر اردو کو نئی روشنی سے آشنا کیا۔ اور شبلی نے تاریخ میں جو کام کیا وہ آج بھی سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ نذیر احمد نے ناول نویسی کا آغاز کیا۔ محمد حسین آزاد جدید نظم کو متعارف کرانے کا باعث بنے۔ المختصر سرسید تحریک کے بالواسطہ یا بلاواسطہ ثمرات کا اثر اس ذہنی نشاۃ الثانیہ کی صورت میں ظاہر ہوا جس نے اردو ادب کو ''تنگنائے غزل'' سے باہر نکالا۔ اسے زندگی کا ترجمان بنا کر اس کی پیچیدگیوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت بھی پیدا کی....... سائنسی مضامین کے تراجم کی طرح بھی سرسید نے ہی ڈالی۔''[۱۴۱]

سرسید احمد خاں کی اردو نثر کے لیے خدمات بجا طور پر قابلِ تعریف ہیں لیکن انھوں نے صرف اردو نثر کے فروغ کے لیے ہی کام نہیں کیا بلکہ ان کی خدمات کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ انھوں نے علمی و ادبی حوالوں کے ساتھ ساتھ سیاسی و معاشرتی اور تعلیمی میدانوں میں بھی مسلمانانِ ہند کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا۔ ان کی تحریک کثیر المقاصد تھی۔ انھوں نے نہ صرف مسلمانان ہند کو جدید تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا بلکہ ان کی سیاسی و معاشرتی بہتری کے لیے بھی اپنا کردار ادا کیا اس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''سرسید نے جو تحریک پیدا کی وہ ہمہ جہت، متنوع اور کثیر المقاصد تھی، سیاسی زاویے سے اس تحریک نے مسلمانوں کی تہذیبی بقا، سیاسی ترقی اور معاشرتی برتری پیدا کرنے کی کاوش کی۔ مذہبی زاویے نے اوہام پرستی کے ازالے اور نئے علوم کی روشنی میں دین فطرت کی توضیح کی اور ادبی زاویے سے اردو زبان کے فروغ وارتقا میں گرانقدر حصہ لیا۔ سرسید نے ادیبوں کی ایسی جماعت بھی بنائی جن کی جدت پسندی نے اردو کو ہمہ جہت ترقی دی۔ مدرستہ العلوم اور رسالہ **تہذیب الاخلاق** اس تحریک کے نقیب اور فعال ادارے تھے...... ادب کو ترجمان حیات تصور کیا اور اسے تنقید حیات بنانے کی سعی کی۔ انھوں نے مسلمانوں کی الگ قومیت کا ادراک پیدا کیا اور اس تصور نے بیسویں صدی کی ایک بڑی سیاسی تحریک کو جنم دیا۔ چنانچہ انھیں بجا طور پر مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا ایسا نقیب تسلیم کیا جاتا ہے جس نے مصلح کا کردار خود بھی ادا کیا اور مصلح ادیبوں کی ایک مخلص اور دردمند جماعت بھی پیدا کی۔''[۴۲]

سرسید تحریک کا تذکرہ اور بھی کئی ادیبوں اور دانشوروں نے کیا ہے۔ زیادہ تر لکھنے والوں نے اس بات پر زور دیا کہ سرسید احمد خاں نے اردو ادب کو زندگی کی حقیقت کا ترجمان بنا کر پیش کیا۔ اُردو نثر کو ترقی دی اور جدید شاعری کی ترویج وترقی میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ اردو ادب کو انگریزی ادب سے استفادہ کی راہ دکھائی، مسلمانوں کے اندر سے فضول اور بے کار رسومات کے خاتمے میں اپنا کردار ادا کیا اور مذہبی افکار کو جدید نظریات کی روشنی میں دیکھنے اور پرکھنے کی روش متعارف کرائی اور جدید علم الکلام کی بنیاد رکھی۔ اس حوالے سے سرسید اور ان کی تحریک پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر ملک حسن اختر رقم طراز ہیں:

''سرسید احمد خاں بڑی بلند وبالا شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو پستی کے گڑھے سے نکالنے کی کوشش کی........ سرسید کی تحریک نے مسلمانوں کی ادبی، مذہبی، سیاسی اور معاشرتی زندگی پر جو اثر ڈالا اس کا مختصر سا ذکر ہم یہاں کرتے ہیں:

① اردو زبان سے محبت پیدا کی اور اردو ادب کو زندگی کی عام حقیقتوں کا ترجمان بنایا۔ اردو نثر کو ترقی کی طرف گامزن کیا اور جدید اردو شاعری کی ترویج میں اہم حصہ لیا۔ اردو ادب کو انگریزی ادب سے استفادہ کی راہ دکھائی۔

② دوقومی نظریہ کی بنیاد رکھی اور مسلمانوں کو کانگرس کے عزائم سے خبردار کیا۔

③ مسلمانوں میں فضول اور ضرررساں رسومات کو ختم کرنے کی تحریک چلائی۔

④ مذہبی افکار کو جدید زمانے کے تقاضے کی روشنی میں دیکھنا سکھایا۔ احادیث کی غیر یقینی سرمایہ علمی قرار دیا۔ اردو میں جدید علم الکلام کی بنیاد رکھی اور مذہبی ادب کے سلسلے میں کئی تصانیف تحریر کریں۔

⑤ انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے اور انگریزی معاشرت سے قرب حاصل کرنے کی راہ پر قوم کو لگایا۔

⑥ سائنسی تحقیقات کو قطعی قرار دے کر ان کی روشنی میں مذہبی مسائل کو بیان کیا گیا۔

⑦ ترقی یافتہ اقوام کے علوم سے استفادے پر لوگوں کو اکسایا۔'' [۴۳]

ڈاکٹر ملک حسن اختر کی آرا کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرسید کی تحریک ایک ہمہ جہت اور ہمہ پہلو تحریک تھی۔ اس تحریک نے ہندوستان کے مسلمانوں کی ہر حوالے سے رہنمائی کی اور انھیں پستی سے نکال کر فراز کی طرف گامزن کیا۔ ان کے اندر جدید علوم وفنون کو پروان چڑھایا، انھیں نیا ذہن اور نئی سوچ عطا کی غرض ان کی سیاسی وسماجی اور معاشرتی ترقی کے لیے بہت اہم کردار ادا کیا۔

سرسید کی ذات اور ان کی تحریک پر لکھنے والوں نے جہاں بہت کچھ ان کی حمایت میں لکھا وہاں اختلافی نقطۂ نظر کا اظہار بھی کیا۔ ضیاء الدین لاہوری نے اپنی تحقیق میں دونوں اطراف کے نقطہ ہائے نظر کو برابر اہمیت دی اور تحقیق کا ایسا معروضی انداز متعارف کرایا جس کی مثالیں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ انھوں نے سرسید تحریک اور سرسید کی شخصیت کے حوالے سے ممکنہ حد تک تمام تحریری سرمائے کو اکٹھا کیا اور اس پر تحقیق کی۔ اور مخالفت موافقت دونوں طرح کے نقطہ ہائے نظر کو قارئین کے سامنے پیش کر دیا۔ انھوں نے سرسید کو ان کے اپنے اصل خیالات ونظریات کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے ان تمام دبیز پردوں کو ہٹانے کی کوشش کی جو عقیدت

مندوں نے سرسید کی شخصیت پر ڈال دیے تھے۔اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے تعصب کی اسی چادر کو بھی اتار پھینکا جو سرسید کے مخالفین نے ان پر ڈال دی تھی۔انھوں نے سرسید کو ان کے اصل رنگ،اصل انداز اور اصل خیالات ونظریات کے ساتھ قوم کے سامنے پیش کر دیا اور فیصلہ قوم اور قاری پر چھوڑ دیا کہ وہ سرسید کی ذات سے کیا تاثر قبول کرتے ہیں۔ضیاءالدین لاہوری نے جہاں سرسید کے خیالات ونظریات کے حوالے سے مخالفین وموافقین کی آرا کو درج کیا ہے وہاں انھوں نے سرسید کے ذاتی خصائل کو بھی بیان کیا ہے۔

سرسید احمد خاں کو اپنی جنم بھومی دِلّی سے حد سے زیادہ لگاؤ تھا۔گو وہ ملازمت کے سلسلے میں اور بعد ازاں تحریکی معاملات کی وجہ سے دِلّی سے دور رہے مگر ان کا دل ہمیشہ دِلّی میں اٹکا رہا۔ وہ عمر بھر دِلّی کا تذکرہ محبت بھرے انداز میں کرتے رہے۔ دِلّی کی تباہی اور بربادی سے حد درجہ ملال ان کو ہوا۔وہ دِلّی کے مسلمانوں کا تذکرہ،ان کے اخلاق وخصائل،رسومات،ان کی مہمان نوازی اور اعلیٰ یہی خصوصیات کو مدتوں یاد کرتے رہے۔۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد جب لوگوں کے مزاج میں بہت حد تک تبدیلی آ گئی تو وہ اس بات پر حیران تھے کہ دِلّی کے لوگوں کے مزاج کو کیا ہوا۔وہ دِلّی سے جدائی پر ہمیشہ ملول رہے۔ان کی دِلّی سے محبت کو ضیاءالدین لاہوری نے بھی ان کے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ملاحظہ ہو:

> ''وہاں کے مسلمانوں ...... کی طبیعت ان کے اخلاق' راہ ورسم' سوشل حالت ایسی تبدیل ہو گئی ہے کہ جب کبھی دِلّی جاتا ہوں اور کسی سے ملاقات ہوتی ہے تو اس کی باتیں سن کر متعجب ہوتا ہوں کہ یہ لوگ کس ملک اور کس دیس کے رہنے والے ہیں! خدا نے دِلّی سے سب کچھ چھین لیا' ذلک تقدیر العزیز العلیم۔[۴۴]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> ''وہاں اکثر دوستوں کا اور بڑے بڑے نامی اور باکمال لوگوں کا مجمع ہوتا تھا۔غالب کی دلکش ومحبت آمیز بزرگانہ باتوں سے،آزردہ کی دلچسپ ودلبر با فصاحت سے،شیفتہ کی متین ونیم خندہ زن وضع سے'صہبائی جاں نواز کے مے خانہ محبت سے،دل شاد شاد رہتا تھا۔''[۴۵]

سر سید احمد خاں کے ذاتی اوصاف کو بیان کرتے ہوئے مختلف لکھنے والوں نے اس حوالے سے بطور خاص بات کی ہے کہ سر سید کو اپنی والدہ سے بہت عقیدت و محبت تھی اور وہ ان کا ہر حکم مانتے، ان کی خفگی اور غصے کو برداشت کرتے تھے اور ان کی پوری طرح سے اطاعت و فرمانبرداری کرتے تھے۔ والدہ جو کپڑا بنا دیتیں پہن لیتے تھے، جو کھلاتیں، کھا لیتے تھے۔ غرض کسی بھی معاملے میں ماں کی حکم عدولی نہیں کرتے تھے۔ اس حوالے سے سر سید کے بیان کو ضیاء الدین لاہوری نے پیش کیا ہے۔

''میں اپنی کل تنخواہ والدہ کو دے دیتا تھا۔ وہ اس میں سے صرف پانچ روپے مہینہ اوپر کے خرچ کے لیے مجھ کو دے دیتی تھیں۔ باقی میرے تمام اخراجات ان کے ذمہ تھے۔ جو کپڑا وہ بنا دیتی تھیں، پہن لیتا تھا اور جیسا کھانا وہ کھلا دیتی تھیں، کھا لیتا تھا۔''[۴۶]

سر سید احمد خاں کے اندر محبت اور جاں فشانی کی خصوصیات بھی بدرجہ اتم موجود تھیں۔ سر سید کی شخصیت پر کھنے والے اکثر قلم کاروں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ سر سید حد درجہ محنتی تھے۔ انھوں نے جس محنت اور جانفشانی سے عمر بھر کام کیا اس طرح بہت کم لوگ کر سکتے ہیں۔ انھوں نے جس محنت و جانفشانی سے علی گڑھ کالج کو تعمیر کیا، اس کے فروغ کے لیے کام کیا وہ انھی کا حصہ ہے۔ سر سید کی محنت و جانفشانی کے حوالے سے سر سید کے ایک بیان کو ضیاء الدین لاہوری نے نقل کیا ہے، ملاحظہ ہو:

''مجھے اس بات کے کہنے سے شرم آتی ہے کہ یہ میری ہی محنت اور جاں فشانی اور تدبیر تھی جو آپ آج کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی اس قدر عالی شان عمارتیں بنی ہوئی دیکھتے ہیں جن کو دیکھ کر نہ صرف ہندوستان کے لوگ بلکہ یورپ اور امریکہ کے سیاح بھی حیران رہ جاتے ہیں۔ جو محنت و مشقت میں نے کی ہے اور جاڑے، گرمی، برسات میں محنت اٹھائی ہے، قلی کا کام میں نے کیا ہے، اوورسیئر کا کام میں نے کیا ہے، انجینئر کا کام میں نے کیا ہے، اپنا ذاتی روپیہ خرچ کرنے میں دریغ نہیں کیا۔''[۴۷]

سر سید احمد خاں کے ذاتی اوصاف میں جہاں محنت و جفاکشی تھی وہاں وہ دوستوں کے

ساتھ بھی بہت خلوص اور محنت سے پیش آتے تھے۔ وہ دوستی اور رشتوں ناتوں کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اس حوالے سے ان کے بیان کو ضیاء الدین لاہوری نے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> ''میں رشتہ وناتے کی سچی محبت اور دوستی کے آگے کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتا....... میں تو اس شخص کو کافر و بے ایمان سمجھتا ہوں جو دوست کی نسبت یہ خیال کرے کہ اس نے خلاف دوستی ومحبت کے کوئی بات کی یا کہی۔ میں تو دوست کے گالی دینے اور برا کہنے کو بھی دوستی پر محمول کرتا ہوں ...... میری تو وہ مثل ہے کہ دوست کو جان وایمان دونوں دیتا ہوں۔''[۴۸]

سرسید احمد خاں کی شخصیت بہت سے اوصاف کا مجموعہ تھی۔ وہ والدہ کے فرمانبردار واطاعت گزار تھے، دِلّی والوں سے محبت رکھتے تھے، دوستوں کے ساتھ مخلص تھے اور محنت وجانفشانی کے عادی تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ ان لوگوں پر بھی خوش ہوتے تھے جو ان کے کارناموں پر تنقید کرتے تھے۔ وہ ملامت سن کر بھی خوش ہوتے تھے اور کبھی ناگواری کا اظہار نہ کرتے تھے۔ ان کی اس عادت کے حوالے سے ان کا ایک بیان ضیاء الدین لاہوری نے یوں پیش کیا ہے:

> ''مجھ کو تو اپنے ہم وطنوں اور بالتخصیص ہم مذہبوں سے بجز لعنت اور پھٹکار سے اور جوتی وپیزار کے اور کسی چیز کی توقع نہیں ہے اور میں اس کے سننے اور کھانے میں خوش ہوں، نہ میرا دل رنجیدہ ہوتا ہے، نہ میں ان کو برا جانتا ہوں۔''[۴۹]

سرسید کے ذاتی اوصاف میں ایک وصف یہ بھی تھا کہ سرسید کے ظاہر وباطن میں تضاد نہ تھا۔ وہ جو کہتے تھے وہی کرتے تھے اور جو کرتے تھے اُسے تسلیم بھی کرتے، اس سے کبھی پیچھے نہ ہٹتے تھے۔ ان کے قول وفعل میں مکمل ہم آہنگی تھی۔ انھوں نے عمر بھر تمام تر مخالفت کے باوجود اپنے افکار وخیالات سے پیچھے ہٹنا گوارا نہ کیا۔ اس حوالے سے سرسید کے خیالات کو ضیاء الدین لاہوری نے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں:

> ''نہایت کمینہ وہ آدمی ہے جو کہتا کچھ ہو اور کرتا کچھ ہو۔ اور اس سے بھی زیادہ کمینہ وہ شخص ہے جو یوں سمجھے کہ در حقیقت شرع کا حکم یہ ہے اور پھر رسم ورواج کی شرم یا لوگوں کی لعن طعن کے ڈر سے اس کے کرنے میں تامل

کرے۔ اس لیے میں کسی انگریز کے ساتھ کھانے پینے میں بشرطیکہ شراب اور سور کا گوشت یا اور کوئی حرام چیز نہ ہو، کچھ بھی تامل نہیں کرتا۔ میرے انگریز دوست میرے یہاں آتے ہیں اور میرے گھر ٹھہرتے ہیں اور ہم اور وہ ایک دسترخوان پر کھاتے ہیں، اور جب میں کسی اپنے انگریز دوست کے ہاں مہمان ہوتا ہوں ان کے ہاں ایک میز پر کھاتا ہوں۔"[۵۰]

سرسید احمد خاں کے ذاتی اوصاف میں سے ایک وصف یہ بھی تھا کہ وہ باقاعدہ نماز ادا کرتے تھے اور اگر کسی موقع پر نماز میں کوتاہی واقع ہو جاتی تھی تو انھیں اس امر پر ندامت ہوتی تھی۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ نماز بروقت ادا کی جائے لیکن اگر کبھی قضا بھی ہو جاتی تو اس کو ادا ضرور کرتے تھے۔ اس حوالے سے ان کے کچھ بیان ضیاء الدین لاہوری نے نقل کیے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

"میں ایک گناہ گار آدمی ہوں، نماز پڑھتا ہوں قضا بھی ہو جاتی ہے۔ جب قضا ہو جاتی ہے، شامتِ اعمال سے اس کی ندامت ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو گنہ گار سمجھتا ہوں، خدا سے معافی چاہتا ہوں۔"[۵۱]

"میں کسی وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا۔ اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا۔ دو دو اکٹھی بھی ملا کر پڑھ لیتا ہوں۔ ریل میں لمبا سفر ہو تو مجھ سے ادا نہیں ہوتی۔ یہ سب باتیں مجھ میں ہیں اور نالائقی اور شامتِ اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے۔"[۵۲]

سرسید نے عمر بھر مسلمانانِ ہند کی بہتری اور ترقی کے لیے کام کیا۔ اس سلسلے میں مخالفت کا سامنا بھی کیا۔ لیکن وہ اپنے مشن پر ڈٹے رہے اور تاحیات اپنے کام کو جاری رکھا۔ مرتے دم تک وہ قوم کو نہ بھولے اور قوم کا درد ان کے دل میں رہا۔ اس حوالے سے ضیاء الدین لاہوری نے سرسید کی ایک دعا نقل کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

"میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ میں اس پاک شخص کی ذُریت میں ہوں جس کے لب مبارک جو آخری وقت پر ہلتے تھے تو "اُمتی اُمتی" کہتے تھے۔ میں اس ذُریت میں ہونے کا نہ اِس وقت بلکہ جب تک میں اس دنیا میں ہوں، فخر کروں گا اور مرنے کے بعد مجھ کو اس کا فخر ہوگا۔ مگر میں ٹھیک اس

ذُریت میں ہونے کا اور اپنے فخر عالم دادا کے پوتے ہونے کا حق اس وقت ادا کروں گا جب میں بھی مرتے وقت، ایسی حالت میں کہ سانس کو سینہ میں گنجائش نہ رہی ہو اور ہونٹ بھی نہایت آہستہ اور خفیف حرکت کرتے ہوں، ''قومی، قومی'' کہتا ہوا مروں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ خدا ایسا ہی کرے۔ آمین'' [۵۳]

گزشتہ صفحات میں سرسید احمد خاں کے جو ذاتی اوصاف بیان کیے گئے وہ بلاشبہ کسی بھی انسان کو ایک بڑے آدمی کے طور پر ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ لیکن سرسید مخالفین کی باتوں کا برا بھی مانتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر وہ اپنے اندر کوئی لیاقت پیدا نہیں کر سکتے تو واہیات کیوں بکتے ہیں، اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس حوالے سے سرسید کے بیان کو ضیاءالدین لاہوری نے یوں بیان کیا ہے۔

''میں ایک مسکین آدمی ہوں، کسی کی برائی میں نہیں البتہ حکام اپنی قدر دانی سے میری عزت اور قدر کرتے ہیں۔ پھر جو لوگ اس پر حسد کرتے ہیں وہ اپنے میں کیوں نہیں ایسی لیاقت پیدا کرتے کہ حکام کی آنکھ میں ان کی عزت وقدر ہو، واہیات بکنے اور کہنے سے کیا ہوتا ہے؟'' [۵۴]

سرسید احمد خاں کے شخصی اوصاف میں یہ بھی شامل ہے کہ انھوں نے کبھی اپنے ان اقدامات سے انکار نہیں کیا جن پر انھیں قوم کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ سرسید احمد خاں نے اسی بات کا کھلم کھلا اقرار کیا ہے کہ انھوں نے انگریزی حکومت کی خیر خواہی کی اور انگریزی حکومت کو بھی اس بات کا ادراک ہے کہ سرسید احمد ان کے وفادار اور خیر خواہ ہیں۔ انھوں نے اسی بات پر حکومت کا شکریہ بھی ادا کیا کہ حکومت انھیں اپنا خیر خواہ اور ہمدرد سمجھتی ہے اور اس کے بدلے انھیں خطابات اور ٹائٹل بھی دیے ہیں۔ اس حوالے سے سرسید کے بیانات کو ضیاءالدین لاہوری نے پیش کیا ہے ملاحظہ ہوں:

''ایامِ مفسدہ میں گورنمنٹ نے میرا خوب امتحان کر لیا ہے کہ میں کیسا گورنمنٹ کا خیر خواہ ہوں۔ میں اپنی عالی گورنمنٹ کا شکر گزار ہوں جس نے میری ناچیز خدمتوں کی عزت کی، مجھے بہت سے خطاب دیئے، ٹائٹل

دیئے، عزت دی۔‘‘[۵۵]

سرسید احمد خاں کے حوالے سے لکھنے والوں کے نظریات میں انتہا پسندی کا عنصر نظر آتا ہے۔ان کے حق میں لکھنے والے ایک انتہا پر دکھائی دیتے ہیں۔سرسید کے حق میں لکھنے والوں نے سرسید کی شخصیت کو اس قدر بڑھا چڑھا کر پیش کیا کہ وہ ایک عام انسان سے بڑھ کر کچھ اور دکھائی دینے لگے۔ان کے خیالات ونظریات کو ایسا بلند وبالا اور پاکیزہ وشفاف قرار دیا کہ ان کے خلاف کوئی لفظ لکھنا یا ان پر تنقید کرنا بے ادبی تصور کیا گیا۔ان لوگوں نے سرسید کے اصل نظریات کو ان کے سیاق وسباق سے ہٹا کر بھی پیش کیا، سرسید کے خیالات ونظریات کی نئی نئی توجیہات تراشی گئیں۔ان کے خیالات کے علمی وعقلی تجزیے کی زحمت گوارا کی گئی، اور یہ تاثر پیش کرنے کی کوشش کی گئی کہ سرسید کی عظمت وسربلندی کے خلاف کچھ لکھنا یا بولنا خلاف ادب ہے۔

سرسید کے خلاف لکھنے والے گروہ کے ہاں بھی ایک دوسری طرح کی انتہا پسندی نظر آتی ہے۔ان کے خلاف لکھنے والوں نے یہ معاندانہ رویہ اختیار کر لیا کہ سرسید کے ہر خیال اور نظریے کی تردید کی جائے اور اس کو باطل قرار دیا جائے۔ یوں سرسید کے حوالے سے لکھنے والوں کے ہاں مثبت اور منفی دونوں طرح کے رویے دکھائی دیتے ہیں۔بعض وہ بھی ہیں جنھوں نے مثبت انداز میں سرسید تحریک کا جائزہ لیا اور بہت سے ایسے اصحاب بھی موجود ہیں جنھوں نے سرسید تحریک کو ہمیشہ منفی انداز سے دیکھا اور اسی حوالے سے لکھا۔ضیاءالدین لاہوری نے اس حوالے سے شمیم حنفی کی رائے کو شامل کتاب کیا ہے۔ملاحظہ ہو:

> ’’سرسید کے مطالعے میں اب تک جو رویے ہمارے سامنے آئے ہیں، اُن میں بالعموم ایک طرح کی انتہا پسندی ملتی ہے، مثبت اور منفی دونوں طرح کی۔سرسید کے تصورات کی تشکیل میں جن عناصر کا عمل دخل رہا، بے شک ان کی نوعیتیں کثیر ہیں، ان میں ایک ساتھ معنی کی گئی سطحیں تلاش کی جاسکتی ہیں، اسی لیے سرسید کی بہت سی باتوں کو متنازعہ بھی سمجھ لیا گیا۔ایک حلقہ تو سرسید کے ان عقیدت مندوں کا ہے جو سرسید کے تصورات کو تنقید سے یکسر ماوراء اور اُن سے اختلاف کی ہر دیانت دارانہ کوشش کو بھی بے ادبی سمجھتے ہیں۔اس حلقے کی طرف سے سرسید کے تصورات کی وضاحتیں تو

سامنے آئیں لیکن اُن کے تصورات کے علمی تجزیے سے سروکار بہت کم رکھا گیا۔ علاوہ ازیں سرسید کی شخصیت میں جو عظمت، ہمہ گیری، دردمندی اور صلابت ملتی ہے اُس کے پیش نظر یہ سوچنا کہ سرسید سے ''اختلاف'' کا جواز سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا، ایک طرح کی سادہ لوحی ہے۔''[۵۶]

ضیاءالدین لاہوری نے سرسید احمد خاں کی شخصیت اور ان کے افکار کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا اور سرسید اور ان کے کارناموں نیز ان کے خیالات ونظریات کے حوالے سے نصف درجن سے زائد کتب تصنیف کیں۔ ضیاء الدین لاہوری لکھتے ہیں کہ سرسید کی سوانح کا مطالعہ کرنے کے لیے ہمیں حیات جاوید سے استفادہ کرنا پڑتا ہے۔ اس حوالے سے ضیاءالدین لاہوری لکھتے ہیں:

''خود نوشت حیات سر سید اور خودنوشت افکار سرسید مرتب کرنے کے دوران میں سرسید احمد خاں کے اپنے الفاظ کے اہم اقتباسات تلاش کرتے ہوئے مجھے ان کی تحریروں اور تقریروں پر مشتمل مواد کا گہرا مطالعہ کرنا پڑا۔ میں نے ان کی سوانح حیات موسوم بہ حیات جاوید مؤلفہ الطاف حسین حالی سے بھی بہت استفادہ کیا۔ مولانا حالی نے اپنی تالیف میں سرسید کی نجی محفلوں یا تقریبات میں ہونے والی گفتگو کے بعض اہم حصے روایت کیے ہیں جنھیں پڑھ کر تصویر کا وہ رخ بھی نظر آجاتا ہے جسے عصر حاضر میں خاص مصلحتوں کے تحت ہم سے چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے یا عجیب وغریب تاویلوں کے سہارے اس میں نیا رنگ بھر کر عوام میں پیش کیا جاتا ہے۔''[۵۷]

ضیاء الدین لاہوری نے معروضی اندازِ تحقیقی اختیار کرتے ہوئے سرسید اور ان کے افکار پر دادِ تحقیق دی۔ انھوں نے ہمیشہ بنیادی مآخذ تک رسائی حاصل کی اور انھی پر اپنی تحقیق کی بنیاد رکھی۔ ان کی تحقیق کا انداز سائنسی ہے اور ان کے پیش کردہ نتائج حقائق پر مبنی ہیں جنھیں جھٹلانا یا ان کی تردید کرنا کارآسان نہیں ہے۔ ضیاء الدین لاہوری کے اسی انداز تحقیق کے حوالے سے جناب ریاض درانی رقم طراز ہیں:

''ضیاءالدین لاہوری سرکاری جامعات سے باہر کی دنیا کے محقق ہیں۔ ان کا دائرہ تحقیق سرسید اور تاریخ وتقویم کے بہت سے موضوعات پر محیط ہے۔زیرِنظر کتاب نقشِ سر سید جناب لاہوری کے تحقیقی سلسلے کی ایک سنہری کڑی ہے۔اس کتاب میں جناب ضیاءالدین لاہوری نے سرسید کی سوانح اور افکار کے مختلف عنوانات پر دادِتحقیق دی ہے۔ان کی تحقیق کی بنا ہمیشہ بنیادی مآخذ پر استوار ہے اور طریقہ کار سائنسی تحقیق کا رہا ہے،اس لیے نہ اُن کی تحقیق کو چیلنج کیا جا سکتا ہے، نہ ان کے نتائج تحقیق کو۔مصنف نے اس کتاب میں مختلف مفروضوں کی تردید بھی کی ہے اور سرسید کے بارے میں بعض لوگوں کی خانہ ساز اور خود ساز روایتوں کا تانابانا بکھیر دیا ہے۔یہ کتاب سرسید کی زندگی اور فکر کا سچا نقش ہے۔بعض لوگوں کو ان کے نتائج تحقیق ناپسند تو ہو سکتے ہیں،مگر ان کی تردید کی بہت کم ہمت ہوسکتی ہے۔''[۵۸]

ضیاءالدین لاہوری نے سرسید کی شخصیت اور ان کے کارناموں کے حوالے سے مستند ترین حقائق کو جمع کر کے پیش کیا۔انھوں نے سرسید کی سچی اور حقیقی تصویر پیش کی اور ان کے خیالات ونظریات کو بھی انھی کے الفاظ میں پیش کیا،بعض دوسرے لکھنے والوں کی طرح ضیاءالدین لاہوری نے سرسید کے خیالات کی خودساختہ تعبیر وتشریح اور توضیح وتوجیح نہیں کی۔اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے سرسید کی شخصیت اور ان کے افکار کے حوالے سے لکھنے والوں کے خیالات کو بھی پیش کیا۔ان کی اس کاوش کے حوالے سے پروفیسر امجد علی شاکر لکھتے ہیں:

''جناب ضیاءالدین لاہوری نے سرسید احمد خاں کی حقیقی تصویریں پیش کی ہیں اُن کے نظریات کی من مانی یا خودساختہ تعبیریں پیش کرنے کی کہیں کوشش نہیں کی۔اس مقصد کے لیے انھوں نے زیادہ تر سرسید کی اپنی تحریروں کو پیش کیا ہے یا سرسید کے قریب ترین رفقا یا مستند سوانح نگار مولانا حالی کی تحریروں کو پیش کیا ہے۔زیرِنظر کتاب میں انھوں نے عہدِ سرسید سے اب تک اُن پر ہونے والے نقد ونظر کا جائزہ لیا ہے اور ایسے منتخب

اقتباسات پیش کیے ہیں جن میں سرسید کے فکر ونظر کا حقیقی منظر نامہ بھی مرتب ہوگیا ہے اور نقد سرسید کی تاریخ بھی ایک تسلسل اور ترتیب سے مدون ہوگئی ہے۔''[۵۹]

ضیاء الدین لاہوری کی تحقیق اور ان کے تحقیقی انداز سے متعلق ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری رقم طراز ہیں:

''ضیاء الدین لاہوری کی حیثیت اس عہد کے تمام مولفوں اور مصنفوں سے قطعی مختلف ہے۔ ان کے پیش نظر کسی نصابی کتاب کی تالیف نہیں تھی۔ سر سید کے بارے میں اپنے افکار وخیالات کو تالیف کر دینے کے شوق میں انھوں نے قلم نہیں اٹھایا۔ تعلیم وتدریس کی کوئی ضرورت اس مشقت کے لیے ان کی دامن کش نہیں ہوئی تھی۔ ان کا مقصد سرسید کی عظمت کی تلاش اور اس عہد میں ان کی معنویت کی دریافت تھی۔ اس کے لیے انھوں نے اپنی زندگی کے تقریباً پچیس برس، اپنی عمر کا بہترین حصہ، اور اعلا ذہنی وفکری صلاحیتیں سرسید پر غور وفکر اور تحقیق میں صرف کی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی تگ ودو کا میدان پاکستان سے انگلستان تک وسیع رہا ہے اور انھوں نے سرسید کی تصنیفات وتالیفات اور مطبوعات کے علاوہ ان کے دستیاب مخطوطات کے ایک ایک حرف کا مطالعہ کیا ہے اور اپنی پسند اور اپنے خیال کے مطابق ایک تالیف کا کارنامہ انجام نہیں دیا بلکہ اس کا ایک ایک لفظ سرسید کے اپنے بیانات وتحریرات سے اخذ کر کے حوالے کے ساتھ درج کر کے سرسید کی خودنوشت کے ہر دو پہلوؤں-- سوانح وافکار کا ایک عجیب وحسین مرقع تیار کردیا ہے۔''[۶۰]

گزشتہ صفحات میں ہونے والی بحث اور ماہرین کی آرا کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ضیاء الدین لاہوری نے سرسید احمد خاں، ان کے افکار وخیالات اور کارناموں کے حوالے سے تمام مستند معلومات جمع کیں، سرسید کی اصل تحریروں کو جمع کیا، ان پر لکھی جانے والی زیادہ سے زیادہ اور اہم تحریروں کو جمع کیا اور اس کے بعد تمام تحریروں کو تحقیق وتجزیے کے مراحل سے گزار کر قارئین کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے تحقیق کا سائنسی انداز اختیار کیا اور مزید یہ کارنامہ سرانجام دیا کہ سر

سید کو ان کے اصل الفاظ کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کیا ورنہ اس سے پہلے سرسید کے خیالات ونظریات کو عجیب وغریب تاویلات کے اندر ملفوف کر کے پیش کیا جاتا تھا اور لکھنے والے صاحبان اپنی مرضی کے نتائج اخذ کرتے تھے۔ ضیاء الدین لاہوری نے اصل تحریروں کو پیش کیا انھوں نے سر سید کے خیالات اور ان کے حق اور مخالفت میں لکھنے والوں کے خیالات کو من وعن پیش کر کے تحقیق کی ایک معروضی روایت قائم کی ہے۔ ضیاء الدین لاہوری کا یہ اندازِ تحقیق مستند بھی ہے اور قابل ستائش بھی کہ اسی کے ذریعے سرسید شناسی کا ایک نیا دروازہ کھلا ہوتا ہے اور آئندہ کے محققین اس سے رہنمائی اور روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ضیاءالدین لاہوری، آثار سر سید، لاہور، جمعیۃ پبلیکیشنز: ۲۰۰۷ء، ص ۱۵۵

۲۔ ضیاءالدین لاہوری، سرسید اور ان کی تحریک، لاہور، جمعیۃ پبلیکیشنز: ۲۰۰۷ء، ص ۱۴۳

۳۔ ایضاً، ص ۱۴۹ ۴۔ ایضاً، ص ۱۴۹

۵۔ ضیاءالدین لاہوری، آثارِ سرسید، ۱۸۳

۶۔ ایضاً، ص ۶۸۔۱۶۷

۷۔ ضیاءالدین لاہوری، **سرسید اور ان کی تحریک**، ص ۶۶۔۱۶۵

۸۔ ضیاءالدین لاہوری، ص ۱۳۱

۹۔ ضیاءالدین لاہوری، آثارِ سر سید، ص ۱۵۹

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۲۶ ۱۱۔ ایضاً، ص ۱۲۶ ۱۲۔ ایضاً، ص ۱۸۹

۱۳۔ ضیاءالدین لاہوری، سرسید اور ان کی تحریک، ص ۱۸۵

۱۴۔ ضیاءالدین لاہوری، نقشِ سرسید، ص ۲۴۱

۱۵۔ ضیاءالدین لاہوری، سرسید اور ان کی تحریک، ص ۲۲۷

۱۶۔ ضیاءالدین لاہوری، خود نوشت حیاتِ سر سید، ص ۲۵۱

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۵۱ ۱۸۔ ایضاً، ص ۲۵۰

۱۹۔ ضیاءالدین لاہوری، سرسید اور ان کی تحریک، ص ۲۱۵

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۱۹ ۲۱۔ ایضاً، ص ۱۹۷ ۲۲۔ ایضاً، ص ۲۰۲

۲۳۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہانپوری، چند خیالات (مقدمہ)، مشمولہ، خود نوشت حیاتِ سرسید، از ضیاءالدین لاہوری، ص ۸

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۸۱ ۲۵۔ ایضاً، ص ۲۶۷ ۲۶۔ ایضاً، ص ۲۶۸

۲۷۔ ایضاً،ص۲۶۸ ۲۸۔ ایضاً،ص۲۶۹ ۲۹۔ ایضاً،ص۲۶۹

۳۰۔ ایضاً،ص۲۶۹ ۳۱۔ ایضاً،ص۲۷۱ ۳۲۔ ایضاً،ص۲۷۱

۳۳۔ ایضاً،ص۲۷۰ ۳۴۔ ایضاً،ص۲۷۰

۳۵۔ ایضاً،ص۲۷۱ ۳۶۔ ایضاً،ص۲۷۰ ۳۷۔ ایضاً،ص۲۷۲

۳۸۔ ایضاً،ص۲۸۰ ۳۹۔ ایضاً،ص۲۵۶

۴۰۔ رام بابو سکسینہ،تاریخ ادب اردو،(ترجمہ مرزا محمد عسکری)لاہور: کتب خانہ ملیہ،ص۱۶۰

۴۱۔ ڈاکٹر سلیم اختر،اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز:۱۹۷۵ء،ص۱۰۸

۴۲۔ ڈاکٹر انور سدید،اردو ادب کی مختصر تاریخ،لاہور،عزیز بک ڈپو:۲۰۰۶ء،ص۴۰۸

۴۳۔ ڈاکٹر ملک حسن اختر، تاریخ اردو،لاہور،یونیورسٹی بک ایجنسی:۱۹۷۹ء،ص۸۴

۴۴۔ ضیاءالدین لاہوری،خود نوشت حیاتِ سرسید،ص۳۲۹

۴۵۔ ایضاً،ص۳۲۹ ۴۶۔ ایضاً،ص۳۲۹ ۴۷۔ ایضاً،ص۳۳۱

۴۸۔ ایضاً،ص۳۳۲ ۴۹۔ ایضاً،ص۳۳۱ ۵۰۔ ایضاً،ص۳۳۳

۵۱۔ ایضاً،ص۳۳۱ ۵۲۔ ایضاً،ص۳۳۱

۵۳۔ ایضاً،ص۳۳۵۔۳۶ ۵۴۔ ایضاً،ص۳۳۳ ۵۵۔ ایضاً،ص۳۳۳

۵۶۔ ضیاءالدین لاہوری، سر سید اور ان کی تحریک،ص۱۹۳

۵۷۔ ضیاءالدین لاہوری،سر سید کی کہانی ان کی اپنی زبانی،جمعیۃ پبلی کیشنز،لاہور:۲۰۱۰،ص۱۱

۵۸۔ محمد ریاض درانی،عرضِ ناشر،مشمولہ، نقشِ سرسید،از ضیاءالدین لاہوری،جمعیۃ پبلی،کیشنز،لاہور:۲۰۰۶ء،ص۷

۵۹۔ پروفیسر امجد علی شاکر،سخنے چند،مشمولہ، سرسید اور ان کی تحریک،از ضیاء الدین،لاہوری،ص۱۴

۶۰۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری،حرفِ چند،مشمولہ،خود نوشت افکارِ سرسید،از ضیاء،الدین لاہوری،لاہور:جمعیۃ پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء،ص۱۶،۱۷

محاکمہ

سرسید شناسی کی روایت کا جائزہ لیں تو ہمیں تین طبقے دکھائی دیتے ہیں۔ایک وہ طبقہ جس نے سرسید کی ان کے مذہبی وسیاسی نظریات کی بنا پر مخالفت کی، دوسرا وہ طبقہ جس نے سرسید کے افکار ونظریات اوران کے کارناموں کی تحسین کی اور تیسرا وہ طبقہ جس نے معتدل رویہ اختیار کرتے ہوئے سرسید کے بعض افکار کی حمایت اور بعض کی مخالفت کی۔سرسید کے حوالے سے لکھنے والوں کے ہاں ایسے تضادات سامنے آتے ہیں کہ قاری مشکل میں پڑ جاتا ہے کہ کس کی بات پر یقین کرے اور کس کی بات کو رد کرے، کس بات کو مبنی بر حقائق تصور کرے اور کسے جھوٹ کا پلندہ قرار دے۔اس صورتحال میں ضرورت اس امر کی تھی کہ کوئی محقق عقیدت وتعصب کی عینک اتار کر غیر جانبداری سے سرسید کے اصل افکار وخیالات کو قارئین کے سامنے پیش کرے تا کہ قاری پر اصل صورتحال واضح ہو،مزید یہ کہ قاری اصل مواد کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنی رائے قائم کرنے کے قابل ہو سکے۔

سرسید شناسی کے سلسلے میں جہاں حمایت ومخالفت میں لکھنے والوں کی کثرت تھی اور ہر طرف دو مخصوص نظریات کی حکمرانی تھی اِن حالات میں ضیاءالدین لاہوری نے میدانِ تحقیق میں قدم رکھا۔انھوں نے سرسید کی شخصیت ،ان کے کارناموں اوران کے افکار وخیالات سے متعلق حقائق جمع کرنے اور ان کے حق اور مخالفت میں لکھے جانے والے مواد کی جمع آوری میں کئی دہائیاں صرف کیں۔انھوں نے اپنی بہترین دماغی اور جسمانی صلاحیتیں سرسید کی شخصیت' ان کے افکاراوران کی حمایت اور مخالفت پر لکھی جانے والی تحریروں پر تحقیق میں صرف کیں۔

ضیاءالدین لاہوری نے کسی مخصوص طبقے کے خیالات کو من وعن قبول نہیں کیا بلکہ انھوں نے حقائق کی کھوج اور جستجو کے راستے کا انتخاب کیا۔یہ کام آسان نہ تھا کیونکہ متعلقہ موضوع سے متعلق مواد ہندوستان، پاکستان اور برطانیہ کے مختلف کتب خانوں میں بکھرا پڑا تھا اور کسی کو یہ خبر بھی

نہ تھی کہ کہاں کونسا مواد موجود ہے۔ ضیاء الدین لاہوری نے اِن اجزائے پریشاں کو بڑی تلاش وجستجو کے بعد اکٹھا کیا اور پھر بڑی محنت اور عرق ریزی سے اس مواد کا جائزہ لیا اور اپنی تحقیقی کتب کو منظرِ عام پر لائے۔ انھوں نے سرسید کے اصل خیالات ونظریات کو قارئین کے سامنے پیش کیا اور فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا کہ وہ سرسید کے خیالات ونظریات سے کیا نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ وہ قاری کے ذہن پر اپنے نظریات کو مسلط نہیں کرتے بلکہ حقائق قاری کے سامنے رکھ کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔

ضیاء الدین لاہوری کی متعلقہ موضوع پر اب تک سات تحقیقی کتب منظرِ عام پر آ چکی ہیں اور محققین وناقدین، دانش وروں، صحافیوں اور قارئین سے دادوتحسین وصول کر چکی ہیں۔ ضیاء الدین لاہوری نے تحقیق کا جو انداز اختیار کیا وہ زیادہ تر مبنی بر حقائق ہے۔ انھوں نے سرسید کے افکاروخیالات کو سرسید کے اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے سرسید کے افکاروخیالات میں اپنے خیالات ونظریات کی آمیزش نہیں کی بلکہ جوتھا من وعن پیش کر دیا۔ ان کی تحقیق قاری کو لفظوں کے گورکھ دھندے میں نہیں الجھاتی بلکہ وہ آسان ترین الفاظ اور سیدھے سادے انداز میں حقائق قاری کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ ان کا حقائق کو پیش کرنے کا انداز ایسا ہے کہ قاری کسی قسم کی الجھن کا شکار نہیں ہوتا۔ قاری حقائق کا مطالعہ کرتا ہے اور پھر آزادی سے اپنی رائے قائم کرتا ہے۔ لاہوری صاحب نہ خود کسی پروپیگنڈے کا شکار ہوتے ہیں اور نہ قاری کے ساتھ یہ ظلم کرتے ہیں۔ وہ تحقیق میں تقلیدی رویہ اختیار کرنے کی بجائے خود حقائق کی تہہ تک پہنچتے ہیں اور گوہرِ مقصود نکال لاتے ہیں۔ وہ سرسید کی اپنی مطبوعہ تحریروں اور بیانات سے اپنی تحقیق کو معتبر بناتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی شہادتوں کو رد کرنا آسان نہیں۔ ان کی تمام کتب تحقیق کے عمدہ معیارات پر پوری اترتی ہیں۔

ضیاء الدین لاہوری نے سرسید پر تحقیق میں اپنی عمرِ عزیز کا ایک طویل دور صرف کیا۔ انھوں نے انڈیا آفس' برٹش میوزیم، رائل ایشیا ٹک سوسائٹی، لندن یونیورسٹی اور پاکستان و ہندوستان کے معروف وغیر معروف علمی خزائن سے استفادہ کیا۔ سینکڑوں کتب اور فائلوں کی ورق گردانی کے بعد انھوں نے ناقابلِ تردید حقائق پیش کیے۔ انھوں نے سرسید کو اس انداز میں پیش کیا جیسا کہ وہ تھے۔ ان کی تحریروں سے بعض لوگ یہ تاثر لیتے ہیں کہ وہ سرسید کے خلاف لکھ رہے ہیں حالاں کہ معاملہ اس سے مختلف ہے۔ سرسید کے پرستاروں نے

سرسید کی جو تصویر پیش کی وہ بہت حد تک حقائق کے برعکس تھی اور سرسید کو اس انداز میں پیش کیا گیا کہ وہ کوئی ملکوتی شخصیت تھے۔ بہت سے ایسے بیانات ان کے نام سے منسلک کر دیے گئے جو سرسید نے کبھی نہ دیے تھے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ باتیں لوگوں کے ذہنوں میں راسخ ہوتی گئیں اور حافظے کا حصہ بنتی گئیں۔ ضیاء الدین لاہوری نے اپنی تحقیق کے ذریعے اس طرح کی باتوں کا رد کیا اور سرسید کے اصل افکار کو قارئین کے سامنے پیش کیا جن کا پرچار سرسید عمر بھر کرتے رہے اور کبھی ان سے پیچھے نہیں ہٹے۔ سرسید سچے آدمی تھے، وہ جو سوچتے تھے وہ کہتے تھے۔ وہ اپنے نظریات کو گول مول انداز میں پیش نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے خیالات کا اظہار صاف لفظوں میں برملا کرتے تھے۔ ضیاء الدین لاہوری نے بھی سرسید کو ان کے اصل نظریات کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا ہے اور گرد کی ان تہوں اور جالوں کو صاف کیا ہے جنھوں نے سرسید کے اصل افکار کو چھپایا ہوا تھا، ان پردوں کو چاک کر دیا ہے جو سرسید کے اصل افکار پر ڈال دیے گئے تھے۔ ضیاء الدین لاہوری نے جو کچھ پیش کیا وہ مستند اور ناقابلِ تردید شہادتوں اور حوالوں کے ساتھ پیش کیا، اس لیے ان کی تحقیق کی بنیاد ٹھوس حقائق پر ہے، محض سنی سنائی باتوں پر نہیں۔ انھوں نے مدح سرائی اور قصیدہ گوئی کے روایتی انداز سے ہٹ کر سرسید کی زندگی اور ان کے افکار پر روشنی ڈالی اور حیاتِ سرسید کے بہت سے ان پہلوؤں کو بھی سامنے لائے جنھیں مصلحت کوشوں نے ارادتاً بیان نہیں کیا تھا۔ یوں انھوں نے سرسید کی ذات کا ایک ہی رخ پیش کرنے کی بجائے سرسید کی مکمل ذات کو ان کے نظریات کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کرنے کا فریضہ سر انجام دیا۔ ان کا یہ اندازِ تحقیق، تحقیق کا ایک صحت مند رجحان ہے۔ لاہوری صاحب مصلحتوں کا شکار نہیں ہوئے اور انھوں نے تمام حقائق چن چن کر پیش کیے۔

ضیاء الدین لاہوری کی تحقیقی کتب انھیں محققینِ عصر میں ایک منفرد اور بلند مقام عطا کرتی ہیں۔ ان کی تحقیقی کتب نے سرسید کی شخصیت اور ان کے افکار کے حوالے سے نہ صرف بہت سے ابہام دور کیے بلکہ سرسید کی اصل شخصیت اور افکار بھی لوگوں کے سامنے پیش کیے۔ ان کی یہ کتب اپنے بلند تحقیقی معیار کی بنا پر نئے محققین کے لیے مشعلِ راہ ہیں اور انھیں تحقیق کے اعلیٰ معیار سے روشناس کراتی ہیں۔

کتابیات

کتب

- آلِ احمد سرور، فکر روشن علی گڑھ:ایجوکیشنل بک ہاؤس،،۱۹۹۵ء
- اصغر علی روحی،مافی **الاسلام** (جلداوّل) ۔لاہور:منظور عالم پریس،۱۹۳۱ء
- پروفیسر اصغر عباس،سر سید،اقبال اور علی گڑھ ،علی گڑھ:ایجوکیشنل بک ہاؤس،۱۹۸۶ء
- ثریا حسین، پروفیسر،سر سید احمد خاں اور ان کا عهد ۔علی گڑھ:ایجوکیشنل بک ہاؤس،۱۹۹۳ء
- حالی،الطاف حسین، مقالات ِ حالی (جلداوّل)۔کراچی:انجمن ترقی اردو پاکستان، س ن
- حالی،الطاف حسین،حیاتِ جاوید۔کان پور: نامی پریس،۱۹۰۱ء
- حقانی،عبدالحق، تفسیر حقانی (جلددوم)۔دہلی: دارالاشاعت تفسیر حقانی، ۱۳۵۷ھ
- خلیق احمد نظامی، پروفیسر،سر سید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے۔نئی دہلی:انجمن ترقی اردو ہند،۱۹۹۳ء
- خلیق احمد نظامی، **علی گڑھ کی علمی خدمات** ۔نئی دہلی:انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۴ء
- ڈاکٹر رفیق زکریا،ھندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج (مرتب)۔نئی دہلی: ترقی اردو بیورو،۱۹۸۵ء
- ڈاکٹر صدیقہ ارمان(مرتب)،سر سید تحریك كاردعمل ۔کراچی:علی گڑھ مسلم اولڈ بوائز ایسوسی ایشن،۱۹۹۹ء

- ڈاکٹر فوق کریمی، سر سید کے سیاسی افکار (مرتب)۔لاہور: ایشیا بک سنٹر، ۱۹۹۰ء
- ذاکر حسین فاروقی، مسلم لیگ کیوں ۔بمبئی: مکتبہ سلطانی، ۱۹۴۷ء
- ذاکر حسین، ڈاکٹر، ذاکر صاحب اپنے آئینہ لفظ و معنی میں۔ (مرتب: ضیاء الحسن فاروقی) دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ، ۱۹۸۷ء
- رئیس احمد جعفری، خطباتِ قائداعظم۔لاہور: شعارِ ادب، لاہور، ۱۹۶۱ء
- زاہد چودھری، روشن خیال، سر سید احمد خاں ۔لاہور: ادارہ مطالعہ تاریخ، ۱۹۹۹ء
- زاہد منیر عامر، ڈاکٹر تاریخ جامعہ پنجاب جلد دوم، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۴ء
- سر سید احمد خان، ایجوکیشنل فلاسفی (مرتب: حفیظ ملک)۔اسلام آباد: نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ کلچرل ریسرچ اسلام آباد، ۱۹۸۹ء
- سر سید احمد خاں، آخری مضامین (مرتب: امام الدین گجراتی)۔لاہور: رفاہِ عام پریس، ۱۸۹۸ء
- سر سید احمد خاں، رائٹنگز اینڈ اسپیچز آف سر سید احمد خاں (مرتب: شان محمد)۔بمبئی: نوچکیتا پبلی کیشنز، ۱۹۲۰ء
- سر سید احمد خاں، سفرنامہ پنجاب (مرتب: سید اقبال علی)۔علی گڑھ: انسٹی ٹیوٹ پریس، ۱۸۸۴ء
- سر سید احمد خاں، مجموعہ لیکچرز و اسپیچیز (مرتب: امام الدین گجراتی)۔ لاہور: مصطفائی پریس، ۱۹۰۰ء
- سر سید احمد خاں، مقالاتِ سر سید، جلد ہشتم (مرتب: شیخ اسماعیل، پانی پتی) لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء
- سکسینہ، رام بابو، تاریخ ادب اردو۔لاہور: گلوب پبلیشرز، ۱۹۸۶ء
- سید عبداللہ، ڈاکٹر، سر سید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فکری و فنی جائزہ۔لاہور: مکتبہ کارواں، ۱۹۶۰ء

- شان محمد پروفیسر،سر سید تاریخی وسیاسی آئینه میں ۔دہلی:یونین پرنٹنگ پریس،س ن
- صفدر سلیمی، پاکستان کا معمار اول۔لاہور:ادارہ طلوع اسلام،۱۹۶۷ء
  ضیاءالحسن فاروقی، اسلام اور عصر جدید۔نئی دہلی:جنوری ۱۹۹۵ء
- ضیاءالدین لاہوری(مرتب)، سر سید کی کھانی ان کی اپنی زبانی ۔ لاہور:جمعیۃ پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء
- ضیاءالدین لاہوری(مرتب)، سرسید کی کھانی،ان کی اپنی زبانی ۔لاہور:جمعیۃ پبلی کیشنز،۲۰۰۵ء
- ضیاءالدین لاہوری(مرتب)،خود نوشت افکارِ سر سید۔لاہور:جمعیۃ پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء
- ضیاءالدین لاہوری،آثارِ سر سید۔لاہور:جمعیۃ پبلی کیشنز،۲۰۰۷ء
- ضیاءالدین لاہوری،جوھر تقویم۔لاہور:جمعیۃ پبلی کیشنز۲۰۰۴ء
- ضیاءالدین لاہوری،خود نوشت حیات سر سید ۔لاہور:جمعیۃ پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء
- ضیاءالدین لاہوری، رویت ھلال موجودہ دور میں۔ لاہور:ضیاءالقرآن پبلی کیشنز،۱۹۸۷ء
- ضیاءالدین لاہوری،سرسید اور ان کی تحریك، نقدونظر کی میزان میں۔لاہور:جمعیۃ پبلی کیشنز،۲۰۰۷ء
- ضیاءالدین لاہوری، نقشِ سر سید۔لاہور:جمعیۃ پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء
- طفیل احمد منگلوری،سید،مسلمانوں کا روشن مستقبل ۔دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۴۰ء
- ظفر حسن،ڈاکٹر،**سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت** ۔لاہور:ادارہ ثقافتِ اسلامیہ،۱۹۹۰ء

- عبدالرزاق ملیح آبادی (مرتب)، آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ۔ لاہور: مطبوعاتِ چٹان، ۱۹۶۲ء
- عبدالحق، ڈاکٹر مولوی، **سر سید احمد خاں، حالات و افکار** ۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۵۰ء
- عبیداللہ سندھی، مولانا، افادات و ملفوظات (مرتب: پروفیسر محمد سرور)۔ لاہور: سندھ ساگر اکیڈمی، ۱۹۸۴ء
- عتیق صدیقی، سر سید احمد خاں، سیاسی مطالعہ ۔ نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۷۷ء
- علی بخش خاں، سیلیکٹڈ ڈاکومنٹس فرام دی علی گڑھ آرکائیوز (مرتبہ یوسف حسین)۔ علی گڑھ: یونیورسٹی پریس، ۱۹۴۴ء
- علی بخش خاں، شہاب ثاقب ۔ لکھنؤ: مطبع نول کشور، س ن
- فقیر احمد فیصل (مرتب)، **انتخاب آل احمد سرور** ۔ لاہور: لاہور اکیڈمی، س ن
- قاسمی، احمد ندیم، **تہذیب** و فن ۔ لاہور: پاکستان فاؤنڈیشن، ۱۹۷۵ء
- کوثر، ڈاکٹر اے ایچ، اردو کی علمی ترقی میں سر سید اور ان کے رفقا کا حصہ ۔ کراچی: لائبریری پروموشن بیورو، ۱۹۸۴ء
- محسن الملک نواب، مجموعہ لیکچرز و اسپیچیز، ۔ لاہور: نول کشور گیس پرنٹنگ ورکس پریس، ۱۹۰۴ء
- محسن الملک، نواب، تحریر فی اصول التفسیر، سر سید احمد خاں ۔ آگرہ: مطبع مفید عام، ۱۸۹۲ء
- محمد اکرام چغتائی، مطالعہ سر سید ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء
- محمد اکرم شیخ، موجِ کوثر ۔ لاہور: مرکنٹائل پریس، ۱۹۲۰ء
- محمد امین زبیری، تذکرہ سر سید ۔ لاہور: یونائیٹڈ پبلی کیشنز، ۱۹۶۱ء
- محمد ضیاء الدین انصاری، ڈاکٹر، مولانا آزاد، سر سید اور علی گڑھ ۔ نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۲ء

- محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، دیباچہ ،**سر سید احمد خاں اور جدت پسندی**، ارتقا مطبوعات، کراچی، ۲۰۰۲ء
- محمد قاسم نانوتوی، تصفیة العقائد۔دارالاشاعت کراچی، ۱۹۷۶ء
- مشیر مخدومی فیروز پوری، پاکستان کی طرف۔لاہور: یونائیٹڈ پبلی کیشنز، ۱۹۴۷ء
- میکالے، لارڈ، میکالے کا نظریہ تعلیم (مترجم: عبدالمجید صدیقی)۔ کراچی: روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی، ۱۹۶۵ء
- ناصر علی دہلوی میر، مقالاتِ ناصری۔کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۶۹ء
- نذیر احمد، مولوی، موعظۂ حسنہ۔دہلی: مطبع انصاری، ۱۳۰۸ھ

اخبارات ورسائل

- الحق (ماہنامہ)۔اکوڑہ خٹک، جون ۱۹۹۹ء
- ایکسپریس (روزنامہ)۔لاہور، ۱۵ دسمبر ۲۰۱۰ء
- برگ گل (ماہنامہ)، سرسید نمبر ۶۹، ۱۹۶۸ء، ص ۲۹۸
- بیدار ڈائجسٹ (ماہنامہ)۔لاہور، فروری ۲۰۰۳ء
- ترجمان القرآن (ماہنامہ)۔لاہور، مئی ۱۹۹۴ء
- **تہذیب** (ماہنامہ)، سرسید نمبر۔کراچی، مارچ ۱۹۹۸ء
- **ختم نبوت** (ماہنامہ)۔ملتان، اکتوبر ۲۰۰۹ء
- ڈان (روزنامہ)۔کراچی، ۱۹ فروری ۲۰۰۸ء
- روئیداد صدسالہ برسی علامہ شبلیؒ کانفرنس، گورنمنٹ پنجاب پبلک لائبریری لاہور، ۲۰۱۵ء
- ساحل (ماہنامہ)۔کراچی، جون ۱۹۸۸ء
- سپوتنک ڈائجسٹ (ماہنامہ)۔لاہور، جنوری ۱۹۹۵ء
- صحیفہ۔لاہور، جنوری تا جون، ۲۰۰۷ء
- فکرونظر (ماہنامہ)۔علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۹۲ء

- کانفرنس گزٹ علی گڑھ (ماہنامہ)۔اکتوبر ۲۰۰۵ء
- معارف،(ماہنامہ)۔اعظم گڑھ،جولائی ۱۹۸۹ء
- نگار (ماہنامہ)،اکبرالہ آبادی نمبر۔کراچی،۱۹۴۹ء،ص ۳۱
- نگار (ماہنامہ)،سرسید نمبر ۱۴۔کراچی:۱۹۷۱ء
- نگار (ماہنامہ)،سرسید نمبر ۲۔کراچی
- **نوائے وقت** (روزنامہ)۔لاہور،۱۵فروری ۲۰۰۹ء

انٹرویوز:

- پروفیسر،امجد علی شاکر، کے ساتھ ایک مصاحبہ،لاہور،۳ جنوری ۲۰۱۶ء
- خالد اعجاز مفتی، کے ساتھ ایک مصاحبہ،لاہور، ۲۷ ستمبر ۲۰۱۵ء

ہماری شاہکار کتابیں

شام کی صبح لبنان کی شام (سفر نامہ)	ڈاکٹر زاہد منیر عامر
اُردو محاورات کا تہذیبی مطالعہ	ڈاکٹر عشرت جہاں ہاشمی
اُردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر	ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی
اُردو نثر میں طنز و مزاح	ڈاکٹر اشفاق احمد ورک
اُردو افسانے کا مغربی دریچہ	ڈاکٹر جواز جعفری
اُردو غزل کا مغربی دریچہ	ڈاکٹر جواز جعفری
اُردو ادب اور آزادیٔ فلسطین	پروفیسر افتخار شفیع
اُردو طنز و ظرافت ۔ فن اور روایت	ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان
استاد الاساتذہ: مولوی ڈاکٹر محمد شفیع	محمد اکرام چغتائی
اقبال: حیات و فکر کے نئے گوشے	ڈاکٹر معین الدین عقیل
اصول انتقاد ادبیات (ایک تنقیدی جائزہ)	پروفیسر جابر علی سیّد
بیتال پچیسی	مظہر علی خان ولا
پردہ اٹھادوں اگر چہرہ الفاظ سے	ڈاکٹر عبدالرحیم
جنوبی ایشیا کی تاریخ نویسی	ڈاکٹر معین الدین عقیل
جدیدیت کا تنقیدی تناظر	اشتیاق احمد
خامہ بگوش ۔ ایک مطالعہ	ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان
خامہ خرابیاں ۔ طنز و مزاح	ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان
غزل آباد ۔ انتخاب شاعری	ڈاکٹر اشفاق احمد ورک

فیض احمد فیض کی شاعری (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد
شیوۂ گفتار (ڈاکٹر سلیم اختر کے انٹرویوز)	ڈاکٹر طاہر تونسوی
سرزنش خار۔تنقیدی مضامین	وارث علوی
آپ بیتی علامہ اقبال	ڈاکٹر خالد ندیم
کلیات فرخندہ لودھی (افسانے)	فرخندہ لودھی
محمد حسین آزاد (انتخاب مضامین)	محمد اکرام چغتائی
مقدمہ شعروشاعری	خواجہ الطاف حسین حالی
مولانا غلام رسول مہر حیات وآثار	ڈاکٹر محمد آصف اعوان
ناول کا فن اور نظریہ	ڈاکٹر محمد یٰسین
ہم دم اقبال۔سرعبدالقادر	ڈاکٹر وحیدالرحمٰن خان
مراکش سحر کرتا ہے (سفرنامہ)	ڈاکٹر ظفر اقبال محسن
میراافسانہ۔آپ بیتی	ملاواحدی دہلوی
مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں 1/2 (مزاح)	مرتب: حسن چشتی
مکالمات جاوید (ڈاکٹر جاوید اقبال کے انٹرویوز)	مرتبہ: اختر النساء
مصطلحات ٹھگی (علی اکبر الہٰ آبادی)	مرتب: رشید حسن خاں
گفتنی شگفتنی (مزاح)	ڈاکٹر وحیدالرحمٰن خان
کلیات نثر مجید امجد	ڈاکٹر افتخار شفیع
غزل آباد۔انتخاب شاعری	ڈاکٹر اشفاق احمد ورک